www.urducouncil.nic.in

جولائی 2017، قیمت:- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

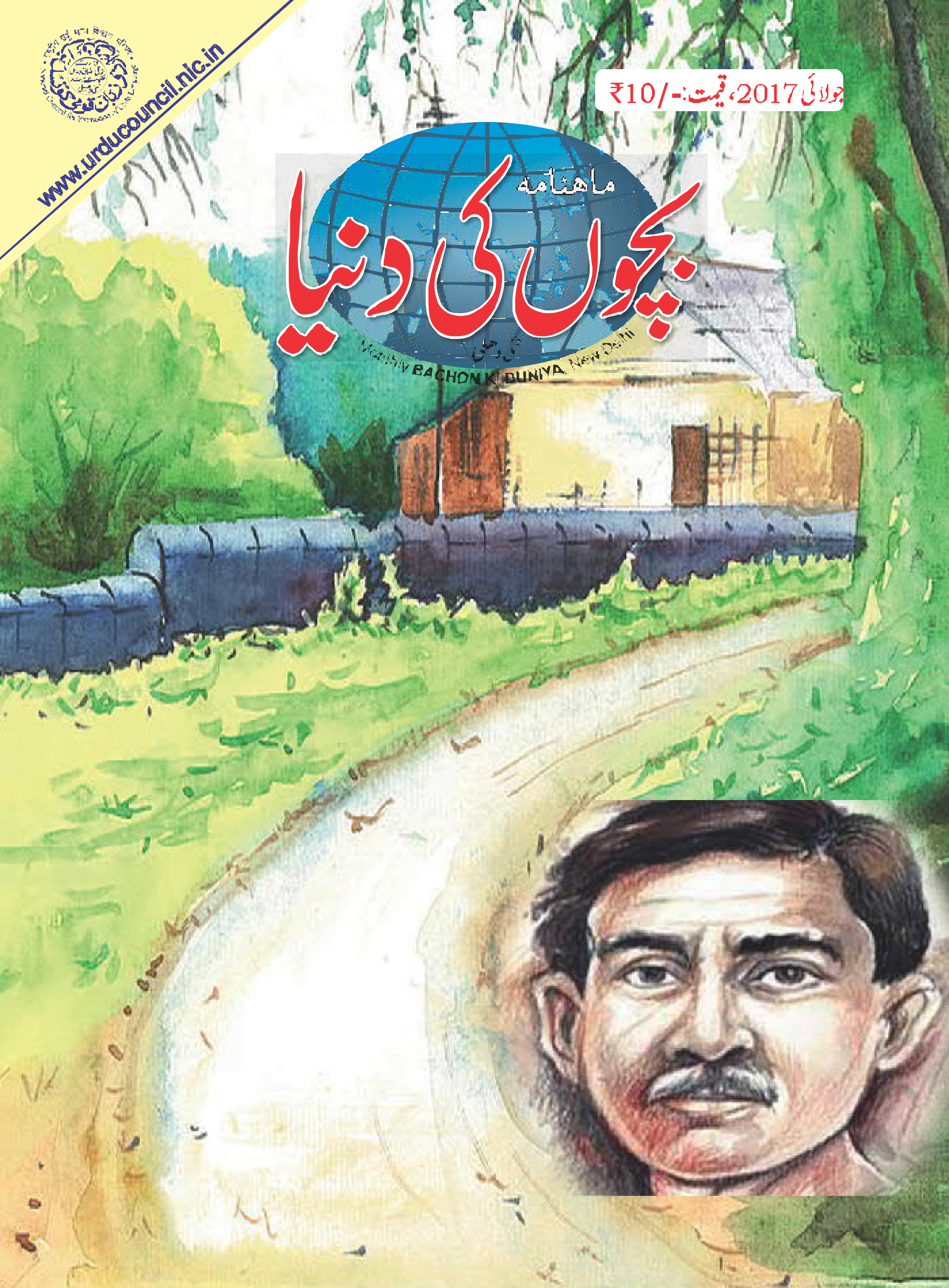

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

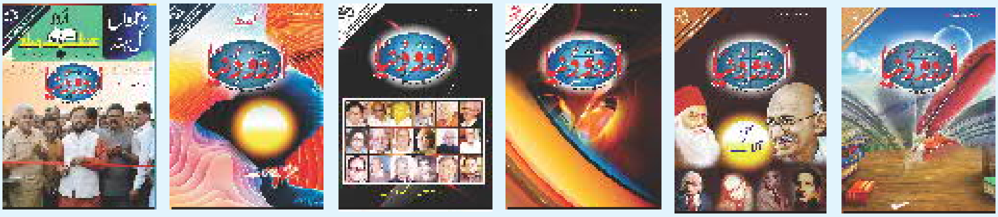

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت اہم تحقیقی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 5 شمارہ: 7 جولائی 2017

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: 10/ روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون:26109746
ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

اس شمارے میں

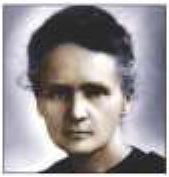

زمرہ	عنوان	مصنف	صفحہ
مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضمون	ریڈیم کی کہانی	اندرجیت لال	06
نظمیں	اپنے چاروں جانب دیکھو	مظفر حنفی	09
	پتنگ	ابواللیث جاوید	10
مضمون	وقت کی قدر کریں!	محمد اکمل خان	11
نظم	چوہا	تنویر پھول	13
مضامین	ہوائی جہاز کی کہانی	انصاری محمد عامر	14
	شہر آرزو لکھنؤ	طوبیٰ ایوب	17
ادب اور سائنس	خلا میں مشاعرہ	خاور نقیب	20
نظمیں	کہہ مکرنیاں	حیدر بیابانی	25
	جاگنے والا کچھوا	احمد پرکاش	26
کہانیاں	چھپے رستم	سراج انور	27
	گاجر کا حلوہ	اسلم آزاد	32
نظم	بارش کا اب موسم آیا	خان رضوان	33
کہانی	چور کی شامت	فیروز بخت احمد	34
باتصویر کہانی	ایک دکھ بھری کہانی	اقبال برکی	36
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	40
کہکشاں	بڑے لوگ بڑی باتیں		49
	دوستی: ایک انوٹ رشتہ	فاطمہ النساء لیاقت اللہ خاں	51
	میٹھے بول	شہزاد عالم اعظمی	52
	پہیلیاں	معراج احمد معراج	53
	آؤ اردو سیکھیں		54
ننھے فنکار	مضبوط سہارا	شفق اسعد بنت اسعد اعظمی	56
	پکنک	مریم جمیلہ بنت مرزا عبدالقیوم ندوی	58
	ہنسی کے غبارے		60
آپ کی باتیں	بچوں کی پینٹنگ		61
	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

دوستو! 'بچوں کی دنیا' جولائی کا شمارہ حاضر ہے۔ جولائی کا مہینہ ہندوستانی تاریخ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ماہ میں مجاہد آزادی چندر شیکھر آزاد (23 جولائی 1906) معروف سیاست داں اور سوراج کا نعرہ دینے والے انقلابی رہنما بال گنگا دھر تلک (23 جولائی 1856) پیدا ہوئے تھے۔ یہی نہیں معروف انقلابی رہنما اور جنوبی افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا (18 جولائی 1918)، ہیری پوٹر جیسا کردار تخلیق کرنے والی معروف مصنفہ جے کے رولنگ (31 جولائی 1965) اور معروف گلوکار مکیش (22 جولائی 1923) بھی جولائی میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اردو زبان و ادب کا ذکر کریں تو بابائے افسانہ منشی دھنپت رائے پریم چند بھی (31 جولائی 1880) کو پیدا ہوئے تھے۔ منشی پریم چند نے اردو زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں سے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو ہی نہیں ہندی میں بھی ان کی تخلیقات قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے ناول دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ پریم چند بچپن سے ہی قصہ کہانیوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔ بچپن میں دادی نانی کے قصے سنے، دیہی علاقے سے تعلق تھا۔ گاؤں کی زندگی کو محسوس کیا اور پھر اپنی کہانیوں میں بھی انھوں نے ہندوستان کے گاؤں کی سچی تصویر پیش کی۔ گاؤں میں شرارتوں میں بھی وہ اول نمبر پر تھے۔ گلی ڈنڈے کے کھیل میں پورے گاؤں میں مشہور تھے۔ ان کا ایک افسانہ بھی 'گلی ڈنڈا' کے نام سے ہے۔ انھوں نے 'بڑے گھر کی بیٹی'، 'کفن' اور 'عیدگاہ' جیسے لازوال افسانے لکھے ہیں۔ ان کا ناول 'گئودان' اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا افسانہ 'عیدگاہ' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک بچہ کی ذہنیت کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے اور عید کی نماز پڑھنے جاتا ہے تو کھلونوں کے بجائے اپنی دادی کے لیے چمٹا خریدتا ہے تاکہ اس کی دادی کو کھانا پکانے میں آسانی ہو اور ان کے ہاتھ نہ جلیں۔ اسی طرح ان کا افسانہ 'پوس کی رات' بھی بہت مشہور ہے۔

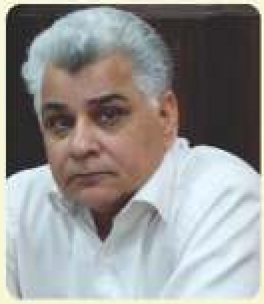

بچو! آپ سب بھی پریم چند یا ان جیسے دوسرے ادیبوں کی کہانیاں پڑھا کریں کیونکہ کہانیاں نہ صرف ہمیں ذہنی تفریح فراہم کرتی ہیں بلکہ ہمارے ملک کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، سماج اور معاشرے کی جانکاریاں بھی ہمیں ان کہانیوں سے ہی ملتی ہیں۔ موجودہ دور میں ساری دنیا ترقی کے نام پر انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون سے چپک کر رہ گئی ہے جبکہ ہمیں اپنی مصروفیت بھری زندگی میں سے کچھ وقت ادب اور کتابوں کے لیے نکالنا چاہیے۔ اچھا ادب ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ اور اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ سب بھی پریم چند، اسمٰعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر، حامد اللہ افسر جیسے بچوں کے معروف ادیبوں کو پڑھا کریں۔ ادب کا مطالعہ یقیناً آپ کی شخصیت میں نکھار لائے گا۔

'بچوں کی دنیا' میں ہم ہر شمارے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کے خطوط سے حوصلہ ملتا ہے۔ اپنے مشوروں سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

میں گریجویشن (انگلش آنرس) کی ایک طالبہ ہوں۔ بچوں کی دنیا کا مطالعہ پچھلے کچھ مہینوں سے کر رہی ہوں۔ ہم اردو والوں کی اردو کی تشنگی بجھانے کے لیے اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ یہ رسالہ ہمارے درمیان پہنچ رہا ہے۔ میں آپ کی محنت اور کوشش کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔

ملکہ تبسم، ریل پار، او۔ کے۔ روڈ، نزد آر۔ سی۔ ایچ ہاسپٹل، آسنسول، مغربی بنگال

مئی 2017 کا شمارہ آموں کے دلکش و دیدہ زیب سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ 'ننھے فنکار' کے گوشہ میں فلک جبیں (برائٹ کوچنگ سنٹر) اور ذیشان انصاری (آسنسول رحمانیہ فری پرائمری اسکول) کی تصاویر شائع کرنے کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ بچے اپنی تصاویر دیکھ کر پھولے نہیں سمارہے ہیں۔

میں تقریباً ایک سال سے 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کی انتھک محنت اور کوششوں سے 'بچوں کی دنیا' میں دن بہ دن نکھار آتا جا رہا ہے۔ اب تو مجھ ناچیز کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ ہر ماہ ڈاکیہ کی آواز سن کر ہی دوڑ پڑتے ہیں کہ شاید 'بچوں کی دنیا' لے کر آیا ہو۔

مئی کے شمارے میں شامل تمام مضامین اور کہانیاں معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ ریل پار سے تعلق رکھنے والے

جناب امتیاز احمد انصاری کا مضمون 'پھلوں کا راجہ آم' کافی دلچسپ اور معلومات کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوا کہ موصوف نے مضمون کی تیاری میں بڑی جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بڑی دل جمعی کے ساتھ آسان اور عام فہم الفاظ میں آم سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ محمد رفیع احمد صاحب کا 'آموں کا کل ہند مشاعرہ' بھی دلچسپی کا سامان لیے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔

محمد گلزار عالم، جہانگیری محلہ، آسنسول، مغربی بنگال

بے شک بچوں کی دنیا طلبا کی ذہنی وفکری تربیت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ رسالے کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ محترم عرض گذارش یہ ہے کہ میں ایک معلم ہوں اور ہمیشہ ہی سے طلبا کے اندر غیر تدریسی کتب کو پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں خود سے لکھنے کا شعور پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میرے طلبا کے مضامین آپ کے رسالے کی زینت بن رہے ہیں۔ آپ ہمارے طلبا کو موقع دے رہے ہیں اس کے لیے شکریہ!

شیخ صادق، معاون مدرس، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، جلگاؤں، مہاراشٹر

اندرجیت لال

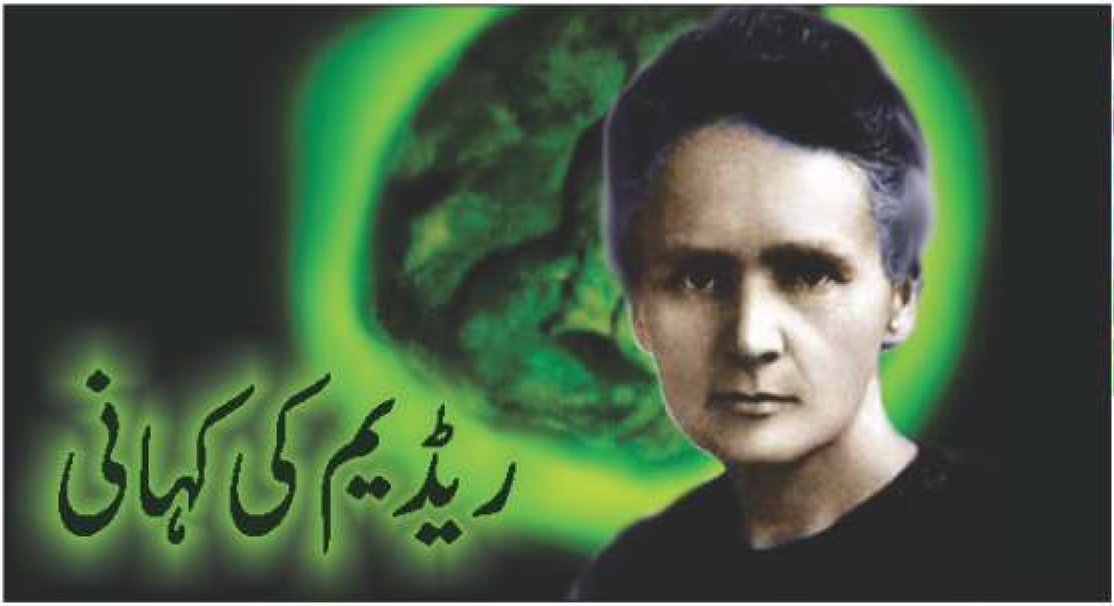

ریڈیم کی کہانی

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی دھات کون سی ہے۔ یہ دھات ہے۔ ریڈیم۔ 1898 میں ریڈیم دریافت ہوا۔ لیکن دنیا اس کی اتنی مقدار حاصل ہی نہیں کر سکی جسے ترازو میں آدھ سیر کے باٹ سے تول سکیں۔ دراصل دنیا بھر کے ذخیروں سے اس وقت تک صرف ایک پاؤ ریڈیم مل سکا ہے۔ ریڈیم کی قدر ہر آدمی نہیں جانتا لیکن جنہیں اس کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً سائنس داں اور ڈاکٹر۔ وہ اس کے ایک ایک ذرہ کی قدر کرتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں۔

ریڈیم کی خرید و فروخت اونس کے حساب سے نہیں ہوتی کیونکہ ریڈیم سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اس کی قیمت سونے سے ڈیڑھ لاکھ گنا زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی خرید وفروخت رتیوں یا گراموں کے حساب سے ہوتی ہے۔ آج تک ریڈیم کی سب سے زیادہ مقدار جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی گئی ہے وہ صرف اڑھائی گرام ہے۔ حساب کے لیے یاد رہے کہ ایک گرام ایک اونس کا پچیسواں حصہ ہوتا ہے۔ اب مزا یہ ہے کہ یہ مقدار بھی فروخت نہیں ہوئی ہے بلکہ چیکوسلواکیہ کی سرکار نے انگلستان کو کچھ تحقیق و تجربے کے کاموں کے لیے اُدھار دی تھی۔

ریڈیم کی دریافت بڑی عجیب طرح سے ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ 1895 میں فرانس کا ایک سائنس داں ہنری بکریل فاسفورس سے ابھرتی ہوئی روشنی پر تجربہ کر رکھا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ یورینیم کے اجزا، فوٹوگرافی کی تختی پر اندھیرے میں کچھ اثر دکھا رہے ہیں یہاں تک کہ اگر کالے کاغذ سے اسے چھپا بھی دیا جائے تب بھی ان کا اثر تختی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ سائنس داں بڑا حیران ہوا مگر ریڈیم کی دریافت کے متعلق کوئی بات نہ بن سکی۔ ہاں سائنس کی دنیا نے جان لیا کہ یورینیم میں روشنی کی طاقت موجود ہے۔ اس زمانے سے اس طاقت سے کام بھی لیا جانے لگا۔ چنانچہ اس وقت سے شیشہ اور چینی کے برتن رنگنے میں ایکسائڈ یورینیم برابر استعمال

ہورہا ہے۔

یہاں پولینڈ کی ایک سائنس داں میڈم کیوری کا ذکر ضروری ہے۔ اس خاتون نے یورنیم کی چھپی ہوئی خوبیوں پر پیرس میں تحقیق شروع کردی اور کچھ تجربوں کے بعد یہ معلوم کرلیا کہ یہ روشنی کی طاقت والا مادہ خود یورنیم تو نہیں ہے بلکہ کوئی اور چیز ہے جو اکسائیڈ یورنیم سے ملی ہوئی ہے۔ میڈیم کیوری نے اس مادہ کو کچھ پتلی شکل میں ڈھال دیا۔ پھر مختلف قسم کے تیزابوں سے دھویا اور صاف کرنا شروع کردیا۔ کچھ عرصے بعد اس بیگم نے تین اونس ایک عجیب وغریب عنصر دریافت کیا۔ یہ عنصر یورنیم سے ساٹھ گنا زیادہ سخت تھا۔ اس سائنس داں کو اپنی دریافت پر بڑا فخر ہوا۔ اس نے اپنا وطن پولینڈ کے نام پر اس عنصر کا نام پولونیم رکھ دیا۔ آپ پولونیم کی دریافت کو ریڈیم کی طرف پہلی دریافت کہہ سکتے ہیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ اس عورت نے تین سال تک اپنی تحقیق جاری رکھی۔ آخر میں اس نے یہ اعلان کیا کہ اوکسائیڈ یورنیم میں روشنی کی طاقت کا اصلی راز اس نے دریافت کرلیا ہے اور وہ راز تھا "ریڈیم"

سرارنیسٹ ردرفورڈ نے اس کے بعد یہ معلوم کیا کہ ریڈیم کی شعاعیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ 'الفا'، 'بیٹا' اور 'گاما' پہلی شعاع مثبت کہربائی ہردن کا مجموعہ ہے۔ دوسری شعاع پہلی سے دس گنا تیز ہے۔ یہ شعاع جلد میں سوا سینٹی میٹر اتر جاتی ہے۔ گاما شعاع سیسے کی بارہ انچ موٹی تختی کو بھی توڑ کر نکل جاتی ہے۔

ریڈیم لگاتار گرمی اور طاقت پیدا کرتا ہے مگر خود دیکھنے میں اس کے جوہر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک گرام ریڈیم سال بھر میں اتنے وزن کی گرمی پیدا کرتا ہے جو تقریباً تیرہ سیر جمی ہوئی برف کو پگھلا کر کھولا دے سکتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ ریڈیم اپنی خوبیوں سے محروم ہونے کے بعد سیسہ ہوجاتا ہے لیکن اس تبدیلی کے لیے ہزاروں برس کا زمانہ چاہیے اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ جو ریڈیم زمین میں 1500 برس قبل مسیح سے موجود ہے وہ اب تک ہی ریڈیم ہی کی شکل میں ہوگا۔

ریڈیم ایک بالکل مختلف مادے سے کیمیائی طور پر تبدیل ہوکر اپنی شکل میں آتا ہے۔ پرانے سائنس دانوں کو یہ معلوم ہوگیا تھا۔ بہرحال وہ اپنی عقل کے زور سے خیال کرتے تھے کہ تمام دھاتیں سونے کی شکل میں تبدیل کی جاسکتی ہیں اور ان دھاتوں سے اکسیر حیات یعنی امرت تیار ہوسکتا ہے اور ایسا امرت ریڈیم سے بھی تیار ہوسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ریڈیم بگڑ کر سیسہ ہوجاتا ہے تو کیا یہ سچ ہے کہ شروع ہی سے زمین میں ریڈیم کی بہت بڑی مقدار موجود تھی اور کیا تمام موجودہ سیسہ کسی زمانے میں ریڈیم ہی کی شکل میں تھا بہت ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ اگر اب ہم مان لیتے ہیں تو پھر زمین بھی شروع میں اپنی موجودہ حالت سے بالکل مختلف ہوگی۔ خالص ریڈیم کا حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس کا اصلی حالت میں پڑے رہنا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ ریڈیم ہوا سے جلد اثر پکڑ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیم کی فروخت اس کے مختلف نمکوں، برومائیڈ، کلورائیڈ، کاربونیٹ اور سلفیٹ کی شکل میں موجود ہوتی ہے۔

ریڈیم سے ڈاکٹری میں بھی بڑے بڑے کام لیے جارہے ہیں۔ ایک سائنس داں نے 1906 میں یہ معلوم کیا کہ اگر سیسہ کی تختی میں ریڈیم کی کرنیں دوبارہ چھان لی جائیں تو وہ جسم کے ان ریشوں کو داخل کردیتی ہیں جن پر سرطان

(Cancer) کا اثر ہو۔ مزا یہ ہے کہ تندرست ریشوں پر ان کرنوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

آج کل ریڈیم مختلف بیماریوں کے علاج میں استعمال ہو رہا ہے۔ مثلاً سرطان کی طرح کے ورم، نقاہت، ذیابیطس، خون کی کمی، ہیضہ، ٹائیفائیڈ میں ریڈیم ایکسریز کے جلے ہوئے زخم اچھے کر دیتا ہے۔ ٹائیفائیڈ، ہیضہ اور بسہری کے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے۔ معدے کو درست کرتا ہے۔ اشتہا پیدا کرتا ہے اور ان کیمیائی تبدیلیوں میں مددگار ہوتا ہے جو ہمارے جسم میں برابر جاری رہتی ہیں۔

ریڈیم کا کچھ نقصان دہ اثر بھی ہوتا ہے۔ بہت عرصے تک ریڈیم کے زیر اثر رہنا نقصان پہنچاتا ہے۔ جو لوگ ریڈیم کے زیر علاج رہتے ہیں وہ اپنی حفاظت سیسے کی دستکیں پہن کر کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کی صحت کو آخر سخت نقصان پہنچنے کا ڈر رہتا ہے۔ ریڈیم کی شعاعیں براہِ راست کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں لیکن آہستہ آہستہ خون کے سفید اور سرخ خلیے بگاڑ دیتی ہیں۔ خون کا دباؤ ہلکا کر دیتی ہے۔ اکثر خون میں کمی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ناخن بدصورت اور ان کے گرد چاروں طرف کی کھال کھردری اور موٹی ہو جاتی ہے۔ چہرہ اور ہاتھوں کی جلد میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

کیمسٹری کے سائنس دانوں کی نظر میں ریڈیم اگرچہ لوہے، تانبے کی طرح ایک دھات ہے مگر سب دھاتوں سے زیادہ وزنی ہے حتیٰ کہ سیسے سے بھی زیادہ اور یہ سب دھاتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں ریڈیم ایک ایسی اکسیر ہے۔ ایک ایسا امرت ہے جو نئی زندگی دیتا ہے۔ ایسی دھات کی بہت مدت سے تلاش تھی۔ یہ جلد ہی دنیا کی کئی بیماریوں کا قابل قدر علاج بننے والا ہے۔ آسمان کی سائنس کے ماہروں کا خیال ہے کہ ریڈیم سورج اور ستاروں کو روشنی دیتا ہے اور ان کی طاقت کا ذمہ دار بنتا ہے۔

ریڈیم نے ڈاکٹری، فزیالوجی، آسمان کی سائنس، بائیولوجی، علم ہندسہ کو اپنی کئی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ اس کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی اور ریڈیم زیادہ سے زیادہ تعمیری کاموں میں استعمال ہوا کرے گا اور زیادہ مقدار میں دریافت ہونا شروع ہو جائے گا۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ریڈیم انسان کے کئی اور کام سنوارے گا۔ علم حیاتیات کے عالموں کی نگاہوں میں "ریڈیم ہی شاید زندگی کا اصل منبع ہے۔" علم ہندسہ کے ماہرین کی رائے میں اگر ریڈیم کی کافی مقدار حاصل ہو جائے تو اتنی عظیم الشان قوت انسان کے قبضے میں آ جائے گی جس کا تصور اس وقت مشکل نظر آتا ہے۔

ایک اور بات۔ دنیا بھر کے سائنس داں اس بات پر لے دے کر رہے ہیں کہ آیا سورج پر ریڈیم موجود ہے یا نہیں، ظاہر ہے آفتاب میں روشنی، حرارت اور توانائی تو ہے ہی۔ جو ریڈیم میں بھی بھرپور مقدار میں پائی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آفتاب کے ہالے میں ہیلیم کی بہت بڑی مقدار موجود ہے یا یوں کہیے کہ خود آفتاب کے اندر بھی توانائی سے لبریز خزانے موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آفتاب کا نور، حرارت اور توانائی، اسی ریڈیم کا کرشمہ ہو— تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ آئندہ برسوں میں کچھ نئے انکشافات کی توقع ہے۔

■

بحوالہ: سائنس کی باتیں: اندر جیت لال
پہلا ایڈیشن: 1982، تیسرا ایڈیشن: 2006
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی

اپنے چاروں جانب دیکھو

امی وہ دن کب آئیں گے
جب گھر میں چاول پکیں گے
سوندھی سوندھی دال بنے گی
ہم سب جی بھر کے کھائیں گے

امی کب تک پہنوں گا میں
یہ پیوند لگا پاجامہ
منگل کے بازار سے مجھ کو
نیکر جرسی دلوا دو نا

میرے سب ساتھی پڑھتے ہیں
میں اسکول نہ جاؤں گا کیا
وہ سب راجا بن جائیں گے
میں ان پڑھ کہلاؤں گا کیا

امی بیچاری کیا بولے
اس کے ابو روٹھ گئے ہیں
ماں کی بیماری کے ہاتھوں
سندر سپنے ٹوٹ گئے ہیں

اے میرے دل والے بچو
اپنے چاروں جانب دیکھو
ایسے کتنے مل جائیں تو
ان کو بھی جینے کا حق دو

■

Prof. Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

پتنگ

میں ہوں ایک پتنگ
کھیلو بچو میرے سنگ

(1)

آسماں کی سیر کراؤں   بادل کے رتھ پر بیٹھاؤں
ہواؤں کے رُخ بتلاؤں   تیرے دل کو بھی بہلاؤں
میں ہوں ایک پتنگ

(2)

ہر دم میں اونچائی دیکھوں   ہر پل میں سچائی پرکھوں
نیچے جو گہرائی دیکھوں   گرنے سے نہ ڈرنا سیکھوں
میں ہوں ایک پتنگ

(3)

اُن ہاتھوں میں ڈور   جو ہے چاروں اور
اس کی مرضی سے اُڑوں   نہ دیکھوں غیر کی اور
میں ہوں ایک پتنگ

(4)

سَت رنگی دنیا جیسی   ویسے میرے رنگ
ہر موسم کے رنگ الگ   چلوں وقت کے سنگ
میں ہوں ایک پتنگ

(5)

خلیل خان کے فاختے   اُڑتے تھے مرے واسطے
اُن کی راہیں روک لیں   گئے وہ اپنے راستے
میں ہوں ایک پتنگ

(6)

واجد علی شاہ کی   ایسی بنی کنیز
لکھنؤ تو چھوڑا لیکن   چھوڑی نہ وہ دہلیز
میں ہوں ایک پتنگ

(7)

فلم والوں نے رنگ کہا   جواں دل کی ترنگ کہا
ہر جیون کی اُمنگ کہا   ہار کے کٹی پتنگ کہا
میں ہوں ایک پتنگ

(8)

نہ تیر بنو نہ تفنگ   نہ کرو اعلانِ جنگ
بننا ہے تو بچو بنو   میری طرح پتنگ
میں ہوں ایک پتنگ

■

Abul Lais Javed
H-17/II, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

محمد اکمل خان

وقت کی قدر کریں!

پیارے بچو! آپ نے بینک کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے بہت سے بچے اپنے ابو کے ساتھ وہاں گئے بھی ہوں۔ بینک میں ہم اپنے پیسوں کو حفاظت کے لیے رکھتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کو نکال کر کام میں لاتے ہیں۔ تصور کیجیے کہ آپ کے پاس ایک ایسا بینک اکاؤنٹ ہے، جس میں روز صبح کوئی 86,400 روپے جمع کر دیتا ہے، لیکن اس پیسے کو آپ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے بلکہ صرف خود استعمال کر سکتے ہیں۔ دن ختم ہوتے ہی آپ کے بینک میں بچے ہوئے باقی پیسے واپس لے لیے جائیں گے۔

ایسے حالات میں آپ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ ایک ایک پیسہ نکال لیں گے۔ ہے نا؟

ہم سب کے پاس ایک ایسا ہی بینک ہے اور اس بینک کا نام ہے 'وقت'۔ ہر صبح وقت ہمیں 86,400 سیکنڈ دیتا ہے اور ہر رات ان سبھی بچے ہوئے سیکنڈز کو ہم سے چھین لیتا ہے جن کو ہم کسی بہترین مقصد کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ ہر صبح آپ کے لیے ایک نیا اکاؤنٹ کھلتا ہے اور اگر آپ ہر دن کے جمع کیے گئے سیکنڈ کو ٹھیک سے استعمال کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں تو یہ ہمیشہ کے لیے آپ سے چھین لیے جاتے ہیں۔

اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ قدرت کی طرف سے ہر صبح عطا کیے گئے اس قیمتی وقت کو کیسے استعمال کرنا چاہتے ہیں یا پھر اسے ضائع کرنا چاہتے ہیں وقت کامیابی کی چابی ہے۔ وقت کا چکر اپنی رفتار سے چل رہا ہے یا یوں کہیں کہ بھاگ رہا ہے۔ اکثر ادھر ادھر کہیں نا کہیں، کسی نا کسی سے یہ سننے کو ضرور ملا ہوگا کہ کیا کریں وقت ہی نہیں ملتا۔ حقیقت میں ہم مسلسل رواں وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل ہی نہیں پاتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وقت کے قیمتی ذخیرہ کی بہتات کے باوجود ہم اس کی کمی کا احساس ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ہے کہ ہم وقت کو صحیح جگہ پر استعمال نہیں کر پاتے۔

ترقی کی راہ میں وقت کی بربادی ہی سب سے بڑی دشمن ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکلا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ ہندی

کے مشہور شاعر نے کہا ہے:

کل کرے سو آج کر، آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی، بہوری کرو گے کب

آج کا کام کل پر اور کل کا کام پرسوں پر نہیں ٹالنا چاہیے، کیونکہ اس سے کام زیادہ ہوتا جائے گا۔ باسی کام باسی روٹی کی طرح بے لذت ہوتا ہے۔ وقت کی قیمتی دولت کو سونے چاندی کی طرح رکھا نہیں جا سکتا کیوں کہ وقت اپنی رفتار سے چل رہا ہے۔ اس پر ہمارا بس تبھی چل سکتا ہے جب ہم اس کا صحیح استعمال کریں۔ وقت کی اہمیت کے متعلق ماہرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ غالب نے ایک شعر میں کہا ہے:

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

یعنی ہم جب کسی کو عزیز رکھتے ہیں تو اس سے عمر بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن افسوس کہ اس زندگی کا تو بھی کوئی پتہ نہیں کہ کب ختم ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ لہٰذا ہر لمحے کو صحیح جگہ استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

چانکیہ (Chanakya) کے مطابق جو انسان زندگی میں وقت کی قدر نہیں کرتا ہے اس کے ہاتھ ناکامیابی اور ندامت ہی آتی ہے۔ وقت جتنا قیمتی اور واپس نہ ملنے والی شے ہے اتنا ہی اس کی اہمیت ہم عام طور پر نہیں سمجھتے۔ لیکن جو لوگ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ عالمی تاریخ میں اپنا نام درج کراتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں۔

ایشور چندر ودیا ساگر (Ishwar Chandra Vidyasagar) وقت کے بہت پابند تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ کالج جاتے تو راستے کے دکاندار اپنی گھڑیاں انھیں دیکھ کر ٹھیک کرتے تھے۔

سائنس کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والا اطالوی سائنسداں گلیلیو (Galileo) دوا بیچنے کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر سائنس کے تجربے کرتا تھا۔ اس کے انھیں تجربوں نے اسے دنیا میں ایک لافانی مقام عطا کیا۔

گھریلو کام کے مصروف لمحات سے وقت نکال کر امریکہ کی ہیریٹ بیچر اسٹو (Harriet Beecher Stowe) نے روایتی غلامی کے خلاف آگ اگلنے والی کتاب "Uncle Tom's Cabin and Civil War" لکھی۔ اس پائے کی کتاب آج تک وجود میں نہیں آسکی۔ فرینک لن (Franklin) نے کہا ہے کہ وقت ضائع مت کرو، کیونکہ وقت سے ہی زندگی بنی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک ترقی یافتہ یا ترقی پسند انسان یا ملک میں ایک چیز یکساں ہے اور وہ ہے 'وقت'۔

وقت کے انتظام کو فطرت کے ذریعے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وقت کا پہیا فطرت میں منضبط ہے۔ دن رات، موسم کا بدلنا ایک متعینہ وقت پر ہوتا ہے۔ اگر کہیں بھی بدانتظامی یا بے قاعدگی آئے گی تو قہر برپا ہو جائے گا۔

وقت سے غفلت برتنے کے نتیجے میں کئی بار کامیابی ہار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نپولین (Napoleon) نے آسٹریا

(Austrai) کو ہرا دیا کیونکہ وہاں کے سپاہیوں نے پانچ منٹ کی دیر کر دی تھی، لیکن کچھ ہی منٹوں میں نپولین قید کر لیا گیا کیونکہ اس کا وزیر وہاں تاخیر سے پہنچا۔ واٹرلو کی (Waterloo) جنگ میں نپولین کی ہار وقت سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کھوئی ہوئی دولت کمائی جا سکتی ہے ۔ بھولے ہوئے علم کو پھر سے یاد کیا جا سکتا ہے لیکن ایک بار کھویا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔

وقت بلندی کی منزل پر چڑھنے کی سیڑھی ہے۔ زندگی کا محل وقت کے گھنٹہ منٹ کی اینٹوں سے بنتا ہے۔ قدرت نے کسی کو امیر یا غریب نہیں بنایا۔ اس نے اپنی قیمتی وراثت یعنی دن کے چوبیس گھنٹے سب کو برابر تقسیم کیے ہیں۔ انسان کتنا ہی محنت سے کام کیوں نا کرے لیکن اگر وہ کام وقت پر نہ ہو تو وہ رائگاں چلا جاتا ہے۔ وقت پر نہ کاٹی گئی فصل برباد ہو جاتی ہے۔ غلط وقت پر بویا گیا بیج کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا ہر ایک لمحہ ایک کامیاب مستقبل کی ضمانت لے کر آتا ہے۔ کیا پتہ جس وقت کو ہم بیکار سمجھ کر ضائع کر دیتے ہیں وہی ہمارے لیے کامیابی کی سب سے اہم گھڑی ہو۔

اس لیے پیارے بچو! وقت کی قدر کرو۔ اس کے استعمال کی منصوبہ بندی کرو تا کہ آنے والے وقت میں یہ تمھارے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

■

Mohd Akmal khan
Flat no. 301, 8-1-21/139, Surya Nagar Colony
Tolichowki-Hyderabad
Telangana-500008

■ تنویر پھول

چوہا

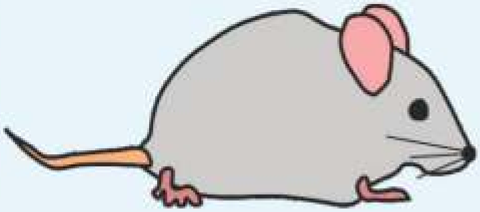

بچو! دیکھو! خوب ہے چوہا
بلی کو مرغوب ہے چوہا
الماری سے نیچے اترے
کاپی اور کتابیں کترے
ٹافی، بسکٹ، نان خطائی
لڈو، پیڑے، دودھ ملائی
اس سے چھپا کر رکھنا مشکل
ان سے لگا ہے چوہے کا دل
لالچ اس کو دن یہ دکھائے
چوہے دان میں یہ پھنس جائے
بن جائے بلی کا نوالہ
چٹ کر جائیں بلی خالہ
سن لو، پھول کی بات ہے یہ سچ
بری بلا ہے بچو! لالچ

■

Tanweer Phool
22 Lake Shore Drive
Apt. 2-C, Watervliet
New York - 12189 (USA)

انصاری محمد عامر

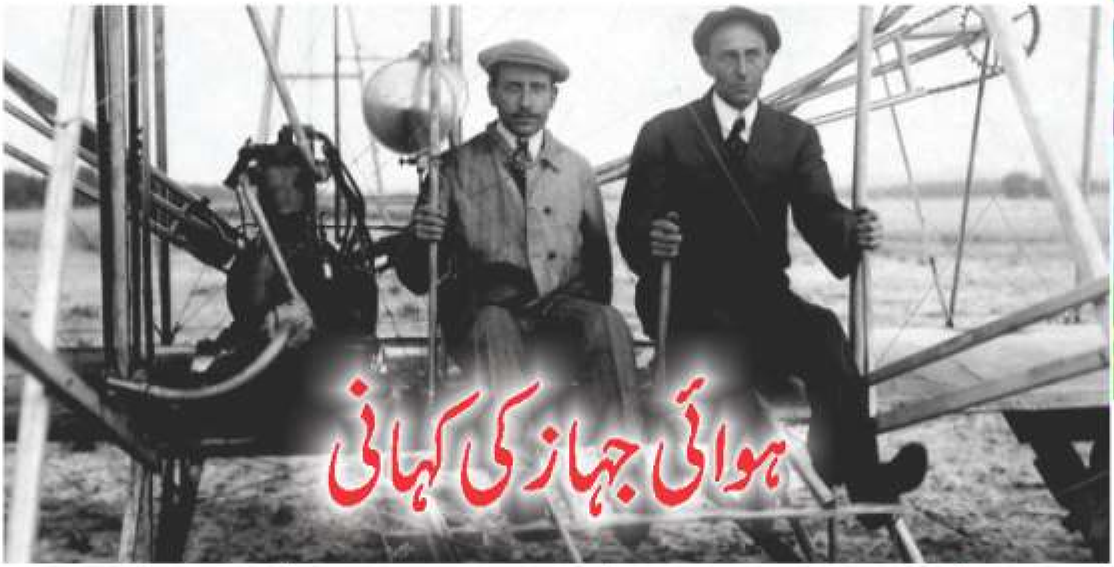

ہوائی جہاز کی کہانی

پیارے دوستو! آپ نے اپنے شہر، گاؤں یا قصبے میں اکثر ہوائی جہاز کے گرجدار انجن کی آواز سنی ہوگی اور سر اٹھا کر اسے آسمان میں اڑتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا اور آپ سب کے دلوں میں ہوائی جہاز کو قریب سے دیکھنے اور اس میں بیٹھنے کی تمنا بھی ہوئی ہوگی۔ لیکن آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ ہوائی سفر کیونکر ممکن ہوا؟ جبکہ صدہا برسوں سے انسان ہوائی سفر کا خواب دیکھتا آیا تھا۔ تو آیئے دوستو! جانتے ہیں کہ کیسے یہ دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور کس طرح ایک جادوئی کہانی نے حقیقت کا روپ دھارا۔

لوگوں کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ الف لیلوی داستانوں کے قالین فقط خواب ہیں۔ حقیقی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن امریکہ کے دو بھائیوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس خواب کو ممکن کردکھایا اور وہ دو بھائی تھے رائٹ برادران Wright Brothers اور ویلی رائٹ Orville Wright اور ولبر رائٹ Wilbur Wright۔ یہ دونوں ملٹن رائٹ Milton wright اور سوزین کیتھرین کوریز Susan Catherine Korener کی سات اولادوں میں سے دو تھے۔ ولبر رائٹ 14 اپریل 1867 کو انڈیانا میں میلویلی (Millville, Indiana) کے مقام پر پیدا ہوا اور اس کے بھائی اورویلی رائٹ کی پیدائش 19 اگست 1871 کو ڈیٹن کے قصبے اوہیو (Dayton, Ohio) میں ہوئی۔

دونوں بھائیوں نے اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ تاہم کوئی ایک بھی ڈپلومہ حاصل نہیں کرسکا اور نا ہی کوئی انجینئرنگ کی ڈگری۔ دونوں بھائیوں میں میکانکس کا خداداد جوہر موجود تھا۔ دونوں کو ہی انسانی پرواز کے موضوع میں دلچسپی تھی لیکن یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ رائٹ برادران کیسے کامیاب ہوئے جبکہ اسی شعبے میں متعدد دیگر لوگ ناکام ہوچکے تھے؟

ان کی کامیابی کی متعدد وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ایک سے بہتر دو ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اکٹھے کام کیا اور مکمل موافقت سے ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ دوسری بڑی اہم وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے طور پر کوئی ہوائی جہاز تیار کرنے سے پہلے خود اڑانا سیکھیں

گے۔ برادران نے پہلے گلائیڈر اڑانا سیکھا۔ 1892 میں رائٹ برادران نے سائیکل بیچنے، مرمت کرنے اور تیار کرنے کی دکان کھولی اس سے انھیں اپنی پرجوش دلچسپی یعنی ہوابازی سے متعلق تحقیقات و تجربات کرنے کے لیے مالی امداد میسر آئی۔ انھوں نے بڑے اشتیاق سے دیگر ماہرین ہوابازی کی تحریریں پڑھیں جو اُن سے پہلے اس میدان میں تجربات و مشاہدات کر چکے تھے جیسے اوٹو لیلینتھل، اوکتاو چنیوٹ اور سیموئل پی لانگلے۔

1899 میں انھوں نے خود ہوابازی کے موضوع پر کام شروع کیا اور گلائیڈر اور پتنگوں سے آغاز کیا۔ 1899 میں انھوں نے ایک بڑے حجم کا گلائیڈر تیار (جو ایک آدمی کا وزن اٹھا سکتا تھا) اور اسے آزمائش کے لیے شمالی کیرولینا میں کیٹی ہاک کے مقام پر لائے مگر یہ قابل اطمینان نہیں تھا۔ 1901 میں انھوں نے دوسرا گلائیڈر تیار کیا اور 1902 میں تیسرا گلائیڈر اڑایا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ تیسرے گلائیڈر میں انھوں نے ہزار سے زیادہ کامیاب پروازیں کیں۔ اپنا طاقتور ہوائی جہاز تیار کرنے سے پہلے وہ دنیا کے بہترین اور انتہائی کہنہ مشق ہواباز بن چکے تھے۔

گلائیڈروں کی پروازوں میں ان کی کہنہ مشقی نے انھیں کامیابی کے لیے بنیاد مہیا کی۔ رائٹ برادران نے درست طور پر یہ ادراک کیا کہ کس طرح ہوائی جہاز کے پہیوں کو زمین سے بلند کر کے ہوائی جہاز کو فضا میں بلند رکھا جائے؟ سو انھوں نے بیشتر وقت اور طاقت ایسا طریقہ دریافت کرنے میں صرف کیا کہ جس سے جہاز کو ہوا میں متوازن اور مستحکم رکھا جاسکے۔

رائٹ برادران نے دو سو سے زائد پروں (Wing) کی مختلف ساختیں بنوائیں اور تجربات کیے جن سے یہ امر واضح ہوتا تھا کہ کس طور 'پر' (Wing) کے اوپر ہوا کے دباؤ کا انحصار 'پر' کی ساخت پر ہوتا ہے۔ ان معلومات سے وہ اپنے ہوائی جہاز کے پروں کی ساخت متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔

آخرکار 1903 میں رائٹ برادران کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور انھوں نے اپنا ہوائی جہاز بنالیا جو ایک ہزار سے بھی کم ڈالر میں تیار ہوا تھا۔ اس کے پر 40 فٹ لمبے اور تقریباً 750 پاؤنڈ وزنی تھے اور 66% (چھیاسٹھ) استعداد کے حامل تھے۔ اس میں 12 ہارس پاور انجن لگا ہوا تھا جس کا وزن صرف 170 پاؤنڈ تھا۔ اپنے جہاز کا نام انھوں نے 'فلائیر ا، FlyerI-I' رکھا اور جسے آج ہم 'کیٹی ہاک Kitty Hawk' کے نام سے جانتے ہیں) یہ جہاز واشنگٹن ڈی سی میں 'نیشنل ایئر اینڈ اسپیس میوزیم National Air and Space Museum میں آج بھی محفوظ ہے۔

پہلی اڑان کا واقعہ شمالی کیرولینا میں کیٹی ہاک کے قریب ڈیول ہل Devil Hill کے مقام پر 17 دسمبر 1903 کو رونما

ہوا۔ اس روز دونوں بھائیوں نے دو دو کامیاب پروازیں کیں۔ پہلی پرواز اور ویلی رائٹ نے کی جو 12 سیکنڈ جاری رہی اور 120 فٹ کا فاصلہ طے ہوا۔ آخری پرواز ولبر رائٹ نے کی جو 59 سیکنڈ جاری رہی اور 852 فٹ کا فیصلہ طے ہوا۔ اگرچہ ان پروازوں کو دیکھنے والے پانچ لوگ وہاں موجود تھے۔ چند ہی اخبارات نے اس کی خبر دی ان کے اپنے قصبے اوہیو (ڈیٹن) کے مقامی اخبار نے اسے مکمل نظر انداز کر دیا۔

کیٹی ہاک میں پرواز کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہ ڈیٹن واپس آئے جہاں انھوں نے نیا ہوائی جہاز 'فلائیر II' تیار کیا۔ اس جہاز میں انھوں نے 1904 میں 105 کامیاب پروازیں کیں۔ 'فلائیر III' کی صورت میں انھوں نے ایک بہترین اور عملی ہوائی جہاز 1905 میں تیار کیا۔ تاہم وہ عوامی توجہ حاصل نہیں کر سکے اگرچہ انھوں نے ڈیٹن میں متعدد پروازیں کیں لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ ہوائی جہاز واقعی ایجاد ہو چکا ہے۔ 1906 میں 'ہیرالڈ ٹریبون Herald Tribune' کے پیرس سے چھپنے والے اخبار میں رائٹ برادران پر دو فلائیرز آر لائیرز Flyers or Liers (پرواز یا فریب) کے عنوان سے مضمون چھپا۔ دراصل لوگوں کو اس بات کو عمومی طور پر ماننے میں کہ انسانی پرواز ممکن ہو چکی ہے، پانچ برس کا عرصہ لگا۔

1908 میں رائٹ برادران نے ان عوامی شکوک و شبہات کو تمام کیا۔ ولبر رائٹ اپنے ایک جہاز میں بیٹھ کر فرانس پہنچا اور وہاں اس نے عوامی مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اپنی ایجاد کی فروخت کے لیے ادارہ کھولا۔ اس دوران امریکہ میں اور ویلی رائٹ ایسے ہی عوامی مظاہرے کرتا رہا۔ بدقسمتی سے 17 ستمبر 1908 کو اس کا جہاز زمین سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ یہ واحد سنگین نقصان تھا جس سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔ ایک مسافر ہلاک ہوا اور خود اور ویلی کی ایک ٹانگ اور دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ تاہم بعد میں وہ ٹھیک ہو گیا۔ تب تک اس کی کامیاب پروازیں امریکی حکومت کو قائل کر چکی تھیں کہ وہ اپنے جنگی شعبے کے لیے ہوائی جہازوں کی رسد کے لیے ان سے معاہدہ کرے۔ 1909 میں قومی بجٹ میں فوجی ہوابازی کے لیے 30 ہزار ڈالر مختص کیے گئے۔

ایک دور میں رائٹ برادران اور ان کے حریفوں کے درمیان اس ایجاد کے حقوق کی نسبت مقدمہ بازی بھی ہوئی تاہم 1914 میں عدالت نے ان دونوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس دوران ولبر رائٹ ٹائیفائیڈ کے بخار میں مبتلا ہو کر 1912 میں چل بسا جبکہ اس کی عمر صرف 45 برس تھی اور ویلی رائٹ نے 1915 میں ہوائی جہازوں کی کمپنی میں اپنے حصص کو فروخت کر دیا اور ہوابازی کی ٹریننگ دینے لگا۔ وہ 1948 میں فوت ہوا۔ دونوں بھائیوں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

اس طرح رائٹ برادران نے اپنی خداداد صلاحیت سے انسان کے اس دیرینہ خواب کو ممکن کر دکھایا اور ان کے سر ہوائی جہاز کی ایجاد کا سہرا بندھا۔ ہوائی جہاز کی افادیت اپنے طور پر کسی طرح کم نہیں ہے۔ نہ حالتِ جنگ میں اور نہ امن میں۔ اگلی چند دہائیوں میں ہوائی جہازوں پر متعدد تحقیقات و تجربات ہوئے اور پھر مزید ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے ہوائی جہاز نے ہماری وسیع و عریض دنیا کو سمیٹ کر مختصر کر دیا۔ نیز یہ کہ انسانی پرواز کی کامیابی نے خلائی سفر کی ترقی کو بھی ممکن بنایا۔

■

Ansari Muhammad Aamir Saleem Akhtar
House No 16, Survey No: 374, Madina Park,
Dhule - 424001 (MS)

طوبیٰ ایوب

مضمون

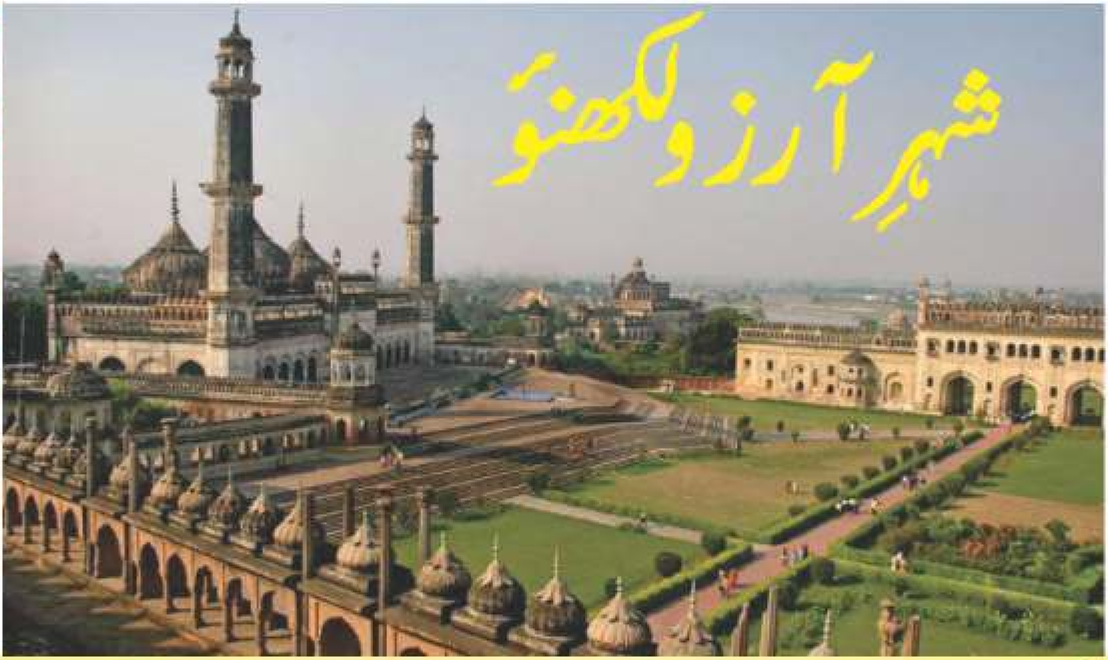

شہرِ آرزو لکھنؤ

لکھنؤ ایک خوبصورت شہر ہے، یہ بات آپ سب کی طرح میں بھی جانتی تھی۔ میری ہمیشہ سے لکھنؤ جانے کی خواہش تھی۔ میرا گھر گورکھپور میں ہے، جب بھی ہم دہلی سے گورکھپور جاتے درمیان میں لکھنؤ آتا۔ ہر بار میرے ابو لکھنؤ کے بارے میں کچھ نہ کچھ نیا بتاتے جس سے میرا وہاں جانے کا من اور زیادہ کرنے لگتا۔ ایک بار جب ہمارا گورکھپور جانے کا ارادہ ہوا تو میں نے ابو اور امّی سے فرمائش کی کہ کیوں نہ ہم اس بار لکھنؤ ہوتے ہوئے گورکھپور چلیں اور امّی ابو میری اس بات پر لکھنؤ سے ہوتے ہوئے گورکھپور جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ پھر ہم ٹرین سے ایک رات کا سفر طے کر کے لکھنؤ پہنچے۔ اس سفر میں میرے ساتھ میری امّی، خالہ اور ابو تھے۔ وہاں کی خوبصورتی دیکھ کر تو میں حیران رہ گئی۔ مگر میں اس خوبصورتی کے مزے صحیح طرح سے نہیں لے پا رہی تھی کیوں کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے امین آباد کی قلفی کے مزے تو لے ہی لیے اور گڑ بڑ جھالے میں ہر طرف سونا ہی سونا دیکھ کے میں تو دنگ ہی رہ گئی۔ لیکن میری امّی نے بتایا کہ یہاں سونے کے جو زیور گہنے دکھائی دے رہے ہیں یہ اصلی سونا نہیں ہے۔ بناوٹی سونے کے گہنے یہاں ملتے ہیں۔ اس بار ہمارے پاس گھومنے کا زیادہ موقعہ نہیں تھا اور پھر اگلے ہی دن ہم وہاں سے گورکھ پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ مجھے دکھ تھا کہ ہم اچھی طرح سے لکھنؤ گھوم نہیں سکے اور میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ ایک بار اور لکھنؤ تو جانا ہی ہے۔

لکھنؤ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کی راجدھانی ہے۔ لکھنؤ نوابوں کا شہر ہے۔ میں اکثر اپنے ابو سے سنا کرتی کہ لکھنؤ میں اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ میں ابو سے کہتی کہ غالب اور اقبال تو لکھنؤ میں نہیں تھے۔ تو ابو نے بتایا کہ میر انیس اور مرزا دبیر جیسے شاعر لکھنؤ میں تھے۔ اسی کے ساتھ خواجہ حیدر علی آتش اور امام بخش

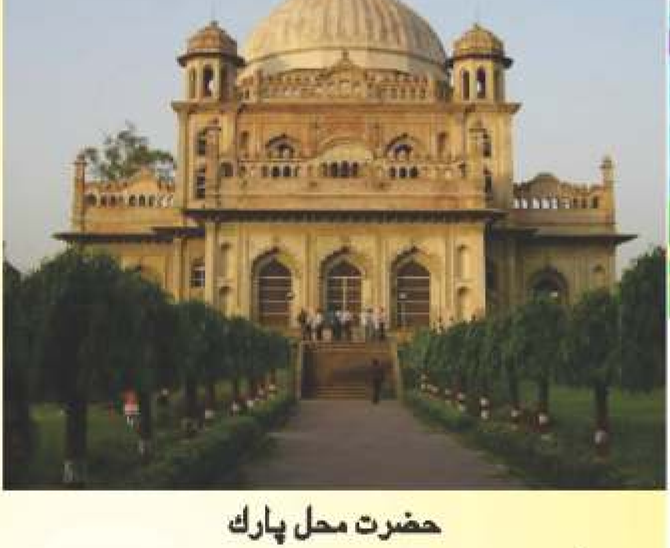

حضرت محل پارک

تاریخ بھی لکھنؤ میں تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور برج نرائن چکبست جیسے ادیب وشاعر بھی لکھنؤ میں تھے۔ ایک بار دلّی کے منڈی ہاؤس میں ابو امی کے ساتھ ڈراما دیکھنے گئی تھی تو ابو نے مجھ سے پوچھا کہ اردو کا پہلا ڈراما کس نے لکھا اور کہاں لکھا گیا؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ ابو نے بتایا کہ اردو کا پہلا ڈراما لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ نے رادھا کنھیا کا قصہ کے نام سے لکھا تھا اور پھر اردو کا دوسرا اہم ڈراما بھی لکھنؤ کے شاعر امانت نے اندر سبھا کے نام سے لکھا۔ یہ سب باتیں سن سن کے میرا جی چاہتا کہ جلدی لکھنؤ جانے کا کوئی بہانہ مل جائے۔

اور اتفاقاً مجھے دوبارہ لکھنؤ جانے کا موقع بھی ملا اور ہم پھر ایک بار دہلی سے لکھنؤ جانے کے لیے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو چارباغ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ میرے ابو نے بتایا کہ لکھنو کے نوابوں نے شہر میں پھلدار درختوں کے کئی باغ لگوائے تھے۔ جیسے چارباغ، عالم باغ، قیصر باغ وغیرہ۔ اب ان مقامات پہ باغ تو نظر نہیں آتے مگر نام باقی ہے۔ ہوٹل میں تھوڑا آرام کر کے ہم گھومنے نکلے تو طے ہوا کہ سب سے پہلے حضرت گنج کے ایک کافی ہاؤس چلا جائے۔ ہم نے رکشہ لیا اور چل دیے کافی ہاؤس۔ وہاں کی کافی تو بڑی ہی اچھی لگی۔ رکشے سے گھومنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے دہلی میں وہ مزہ کہاں۔ امّی اور ابّو سے اس کافی ہاؤس کے بارے میں سنا تھا۔ جانا تو پچھلی بار ہی تھا لیکن جیسا کی میں نے بتایا تب میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے نہیں جا پائی تھی۔ اس بار تو جانا ہی تھا۔ وہاں ہم نے کافی پی اور اڈلی ڈوسہ کھا کر نکلے تو یہ طے ہوا کہ اب بڑا امام باڑا چلا جائے۔ پھر رکشہ کیا اور چلے بڑا امام باڑا کی طرف۔ ابّو نے

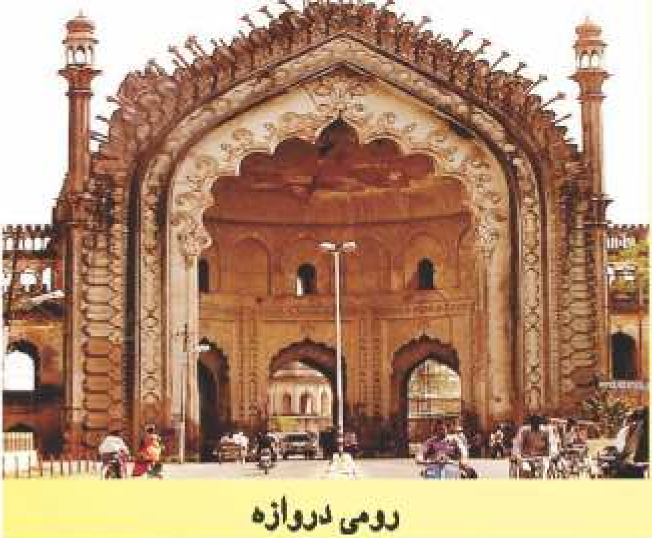

رومی دروازہ

لکھنؤ کی کئی تاریخی جگہوں کے بارے میں بتایا تھا، اس میں سے ایک بڑا امام باڑا بھی تھا۔ ابو نے بتایا تھا کہ 1748 میں آصف الدولہ نے بڑا اما مباڑا کی تعمیر شروع کروایا تھا اور 1771 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں وہاں کی ایک خوبصورت تصوراتی تصویر بنی ہوئی تھی لیکن اصل میں تو وہ اور بھی اچھا ہے۔ ہم نے وہاں بڑے مزے کیے۔ وہاں جاتے وقت راستے میں ہم نے رومی دروازہ بھی دیکھا۔ وہاں سب سے زیادہ مزہ تو بھول بھلیا میں آیا اور جب کوئی بڑا امام باڑہ دیکھنے جائے تو باولی بھی دیکھنے کی جگہ ہے۔ ہم وہ دیکھنے جا رہے تھے تو بیچ میں ایک جگہ آئی جس کا Texture بالکل U shape جیسا تھا۔ وہاں U shape کا راستہ تھا اور بیچ کی جگہ بالکل خالی وہاں سے کوئی نیچے بھی گر سکتا ہے اور اگر گرا تو گیا کام سے۔ ویسے ہم نے وہاں بہت ساری Photos بھی کھینچیں۔ واپسی میں ہم بیگم حضرت محل پارک سے گزرے۔ ہم کار سے قیصر باغ تک آئے۔ وہاں سے ہم رکشہ میں سوار ہوئے۔ نظیر آباد روڈ سے ہوتے ہوئے امین آباد پہنچے۔ نظیر آباد روڈ پہ ہم نے لکھنؤ کے مشہور چکن کے کرتے خریدے۔ اس سے پہلے میں صرف چکن قورمہ، چکن اسٹو اور چکن بریانی جانتی تھی۔ میری امی نے مجھے چکن کے کپڑوں کے بارے میں بتایا۔ واقعی یہ کپڑے بہت خوبصورت تھے۔ ان پہ ہاتھ سے کی گئی کڑھائی کا تو جواب نہیں۔ یہاں سے ذرا ہی آگے بڑھنے پہ مشہور ٹنڈے کبابی کا بورڈ نظر آیا۔ لکھنؤ میں ٹنڈے کبابی اور رحیم کی نہاری بہت مشہور ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے اور زیادہ نہیں گھوم پائے۔ اب ہماری ٹرین کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے رکشہ لیا۔ نا کہ ہنڈولہ ہوتے ہوئے ہم چار باغ کے اپنے ہوٹل پہنچے۔ جلدی جلدی سامان پیک کیا۔ ہمارے ہوٹل سے چار باغ کا ریلوے اسٹیشن زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم دس منٹ میں پلیٹ فارم پہ پہنچ گئے۔ گورکھپور جانے والی ٹرین پلیٹ فارم نمبر دو پہ کھڑی تھی۔ طے وقت پہ ہماری ٹرین روانہ ہوئی۔ ابو نے بتایا کہ یہ ٹرین بارابنکی، گونڈہ، بستی اور خلیل آباد میں رکتی ہے اور اسے لکھنؤ سے گورکھپور پہنچنے میں پانچ گھنٹے لگیں گے۔ امام باڑہ گھوم کر اور ٹنڈے کے یہاں کباب کھانے کے بعد اب مجھے نیند آ رہی تھی۔ اس لیے میں اوپر کی برتھ پہ جا کے لیٹ گئی۔ اب ٹرین گورکھپور کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے کہا خدا حافظ لکھنؤ۔

■

Miss Tooba Ayub
Flat No.: 304-B, Susheel Suhag
367/B-1,Near Pal Dairy, Munirka
New Delhi - 110067

خاور نقیب

گھر پہنچتے ہی ذہین کی زبان چل پڑی۔ وہ اپنی ماں کو سائنس میلے کے بارے میں فر فر بتاتا چلا گیا۔ اس کی ماں سلطانہ بیگم اپنے بیٹے کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھیں:

روی: انکل، آپ نے بڑی دور کی سوچی ہے۔ مزہ آئے گا۔

ذہین: ہماری زمین کے بعض خلائی سائنس دانوں خاص کر فرینک ڈریڈ کا خیال ہے کہ خلا (Space) میں بھی مختلف شکل و صورت کی مخلوقات آباد ہیں۔ لیکن اس کا اب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ہے۔

عارف: انکل، میرا خیال ہے کہ مشاعرے کا اعلان سن کر کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم اپنی زمین (Earth) کی حدوں سے باہر خلائی زندگی (Extra Teristrial life) کا مشاہدہ کرنے والے پہلے سائنس داں تسلیم کر لیے جائیں گے۔

روبوٹ: ہاں بچو، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کا نام روشن ہو۔ تم سب اسی جگہ آرام کرو۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر روبوٹ اپنی اڑن طشتری کی طرف روانہ ہوگیا۔

بچے چٹانوں پر ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ روبوٹ ایک کھڑی چٹان کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آگیا۔

روبوٹ: بچو، خوش ہو جاؤ۔ میں نے آپ لوگوں کی طرف سے ایک پیغام مشینی تکنیک کے ذریعے نشر کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ پیغام نزدیک اور دور کے ستاروں تک جلد ہی پہنچ جائے گا۔

ذہین: انکل، آپ نے کیا خوب یاد دلایا۔ ہماری زمین کے سائنس دانوں نے ''اوری سیبو ریڈیائی دوربین'' کے ذریعہ 16 نومبر 1947 کو اسی انڈرومیڈا یعنی M-31 کے لیے ایک ریڈیائی پیغام بھیجا تھا۔

روبوٹ: ارے واہ، تم واقعی ذہین ہو۔ تم کو بہت ساری باتیں یاد ہیں۔

ساجدہ: انکل، ہمارا یہ پیغام ستاروں تک کب پہنچے گا؟

روبوٹ: قریب کے ستاروں اور سیاروں کو اب تک پہنچ چکا ہوگا۔ لیکن جو دور ہیں ان تک ذرا دیر سے پہنچے گا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دھماکوں کی لگاتار گونج سے زمین لرز اٹھی۔ بچوں کو لگا کہ انڈرومیڈا پر شہابی پتھروں (Meteo rite) کی بارش ہو رہی ہو۔ وہ بھی دوڑ کر ایک بڑی چٹان کے سائے میں آ گئے۔ پھر بچوں نے وہ منظر دیکھا کہ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان کے سامنے والے میدان میں طرح طرح کے روبوٹ اور خلائی جہازوں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ مختلف شکل وصورت کے سیکڑوں روبوٹ اور خلائی مخلوقات کو دیکھ کر بچوں کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے سائے لہرانے لگے۔ بچوں کی یہ حالت دیکھ کر انکل روبوٹ نے انھیں دلاسا دیا کہ یہ بھی ہمارے مہمان ہیں۔ ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ آؤ ہم ان کا استقبال کریں۔ بچے، روبوٹ کے ساتھ آگے بڑھنے لگے مگر وہ اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ ان کے قدم بہ مشکل اٹھ رہے تھے۔ انکل روبوٹ آگے بڑھ کر مہمانوں سے ملاقات کرنے لگا۔ وہ خلائی زبان میں ان سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بچوں میں ہمت پیدا ہوئی اور وہ آگے بڑھ کر مہمان روبوٹوں سے ہاتھ ملانے لگے۔ اس طرح خلائی مہمانوں سے ملاقات کا سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ ایک دوسرے سے تعارف اور ملاقات کے بعد انکل روبوٹ بچوں کے ہمراہ سفید رنگ کی ایک چٹان پر چڑھنے لگا۔ جو زمین سے قدرے بلند اور ہموار تھی۔ روبوٹ بچوں کے ساتھ چٹان پر پہنچ کر خطاب کرنے لگا۔

انکل روبوٹ: میں انڈرومیڈا کی سرزمین پر خلائی مہمانوں کا پرجوش استقبال کرتا ہوں۔ آپ حضرات نے ہماری دعوت قبول کی اور اس خلائی مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لیے یہاں آنے کی زحمت اٹھائی۔ میں بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے زمین کے ان ننھے منے بچوں کو اپنی بے پناہ شفقتوں سے نوازا ہے۔ آج کا یہ خلائی مشاعرہ ان ہی بچوں کی معصوم خواہشوں اور بلند حوصلوں کا نتیجہ ہے۔ میں خلا کے باشندوں کی جانب سے ان ننھے منے شاعروں کا دلی استقبال کرتا ہوں اور خلا میں ہونے والے اس اوّلین معاشرے کی صدارت کے لیے محترمہ Bee-Robo کا نام پیش کرتا ہوں۔

انکل روبوٹ کی اس تقریر سے خوش ہو کر روبوٹ کا ایک بڑا مجمع جھومنے لگا۔ ان کے جسم سے کرنوں کی پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ بی۔ روبو پروں سے رنگوں کی پھواریں اڑاتی ہوئی اسٹیج پر اتر آئی۔

انکل روبوٹ: محترم حضرات! آج ہمارے درمیان پانچ ننھے منے قلم کار تشریف فرما ہیں۔ وہ اپنا کلام اپنی زبان میں پیش کریں گے جس کو سن کر آپ حضرات عش عش کر اٹھیں گے۔ سب سے پہلے میں ساجدہ صدف کو دعوت سخن دیتا ہوں۔ وہ تشریف لائیں اور اپنا کلام پیش کریں۔

ساجدہ صدف: میں انکل روبوٹ اور دور دراز کے ستاروں سے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ بھی حضرات نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہمیں بھی محبتوں سے نوازا۔ کلام حاضر کر رہی ہوں۔

ملاحظہ فرمائیں۔ (اسٹیج سے ارشاد کی آواز ابھرتی ہے)

خلا کے مکینوں کو میرا سلام
چمکتے نگینوں کو میرا سلام
یہاں کے ہیں روبوٹ اچھے بہت
کھلونوں کے جیسے ہیں بچے بہت
بناؤں گی میں اینڈرومیڈا میں گھر
ستاروں کی جھرمٹ لٹائے گی زر
غزل ایک ایسی سناؤں گی میں
ستاروں کو شاعر بناؤں گی میں
اجالوں کی محفل سجے گی یہاں
صدارت کریں گے یہ غالب میاں
اگر علم کے گیت گاؤں گی میں
بلندی کے رازوں کو پاؤں گی میں
کبھی بناؤں گی زہرہ کو میں
یہ پیغام بھیجوں گی عذرا کو میں
زمیں پر بموں کی حکومت ہے آج
سیاست کے سر پر جنوں کا ہے تاج
بتاؤ زمیں کیسے آباد ہو
حسد، بغض و کینہ سے آزاد ہو

ساجدہ کے انداز اور کلام کی روانی سے متاثر ہو کر پورا مجمع واہ واہ کر اٹھا۔ داد و تحسین کے ساتھ رنگ رنگ کے شعاؤں کا رقص ایسا منظر پیش کر رہا تھا گویا اینڈرومیڈا پر رنگ و نور کا سمندر لہریں لے رہا ہو۔

انکل روبوٹ: حضرات، لگتا ہے کہ آپ بچوں کی اس پیاری زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ اب میں روی فراق کو کلام پیش کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

روی فراق: اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے مشاعرے سے خلا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ یہ مشاعرہ مدتوں یادگار بنا رہے گا۔ چند اشعار حاضر کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

خلا میں کئی شہر آباد ہیں
غباروں کے نرغے سے آزاد ہیں
جدھر دیکھیے خامشی کا ہے راج
یہی خامشی اس جگہ کی ہے لاج
مرا شوق رنگوں میں ڈھلتا ہوا
ستاروں کی جھرمٹ میں پلتا ہوا
اچھلتا ہوا اور مچلتا ہوا
بلندی کی سڑکوں پہ چلتا ہوا
کبھی ڈگمگا کر سنبھلتا ہوا
کبھی حد سے آگے نکلتا ہوا
ستاروں کے روشن نگر میں رہے
مرا خواب یونہی سفر میں رہے

ہر طرف سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی۔ پی۔ روبو نے پروں کو پھڑ پھڑا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

انکل روبوٹ: سامعین کرام، مشاعرہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ آج خلا کی اس عظیم بلندی پر یہ بچے اردو کے سفیر بن کر آئے ہیں۔ اب آپ کے سامنے راکیش چکبست تشریف لا رہے ہیں۔

راکیش چکبست: آداب عرض ہے۔ نظم کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں، سماعت فرمائیں:

ابھی میں ستاروں کی وادی میں ہوں
چمکتے نظاروں کی وادی میں ہوں

مرا عزم پرواز بھرنے لگا
ستاروں کو بیدار کرنے لگا
نگاہوں میں نیپچون کی تصویر ہے
خیالوں میں پلوٹو کی تنویر ہے
گلیکسی کا منظر ہے کیا ہی عجب
عجب رنگ و رامش، عجب اس کے ڈھب
ستاروں کی پگڈنڈیوں پہ رواں
مرا عزم ہر دم رہے گا جواں
خلا کی یہ تہذیب کیا خواب ہے
جسے دیکھیے لگتا محبوب ہے

انکل روبوٹ: واہ، واہ، آج کی یہ محفل ایک تاریخ بنارہی ہے۔ میں نے بھی ان بچوں کے لیے چند اشعار کہے ہیں۔ پیش کررہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

(ارشاد ارشاد کی آواز آتی ہے)

مجھے ایسے بچوں پہ آتا ہے پیار
بلندی سے ہوتے ہیں جو ہم کنار
جری، حوصلہ مند، بے باک ہیں
خلائی سمندر کے تیراک ہیں
کتابوں کو رکھتے ہیں بے حد عزیز
بزرگوں کی نظروں میں ہیں باتمیز
سوالوں کے دیتے ہیں فرفر جواب
کھلاتے ہیں علم و ہنر کے گلاب
انھی سے ہے ہولی، انھی سے ہے عید
ہیں بچے ہی اردو زباں کی امید
شب و روز محنت کریں گے یہی
زمیں کی حفاظت کریں گے یہی

انکل روبوٹ کے اشعار سن کر ہر کوئی واہ واہ کیے جارہا تھا:

انکل روبوٹ: میں شکرگزار ہوں۔ حضرات! اس میں میرے کمال کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ زبان ہی ایسی ہے کہ جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اب میں عارف اقبال سے التماس کرتا ہوں وہ مائک پر تشریف لائیں۔

عارف اقبال: سامعین کرام! عزم اور حوصلہ کے بغیر زندگی کو بلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہی بات میں نے اپنے کلام میں بھی رکھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

طبیعت بلندی پہ مائل ہوئی
خلا میری خواہش کی منزل ہوئی
نظاروں کو حسنِ نظر دوں گا میں
خلا میں اذانِ سحر دوں گا
نظر ڈھونڈتی ہے بشر ہے کہاں
بشر کی وہ شام و سحر ہے کہاں
نہیں کچھ بلندی کا شاہیں کو غم
پہنچ کر وہ مریخ پر لے گا دم
خلا کے تصور میں ڈھلتا ہوں میں
فرازِ خودی پہ مچلتا ہوں میں
یہاں شاعری کا ہے انداز اور
خیالات بھرتے ہیں پرواز اور
محبت کی پھیلی ہے خوشبو یہاں
بلندی پہ ہے آج اردو زباں

واہ واہ کی صداؤں سے پورا میدان گونج اٹھا۔ روبوٹوں کی حرکتوں سے اندازہ ہورہا تھا جیسے وہ رقص کررہے ہوں۔

انکل روبوٹ: عارف اقبال نے مشاعرے کو کامیابی کی

بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اب میں مشاعرے کے آخری شاعر ذہین غالب کو دعوتِ سخن دیتا ہوں۔ وہ تشریف لائیں۔

ذہین غالب: میں اہلِ زمیں کی جانب سے روبوٹ برادری کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس ادبی محفل کو اپنی شرکت سے منور کیا۔ آج خلا میں اردو کی جو شمع روشن ہوئی ہے۔ اس کی لو سے سیکڑوں شمعیں روشن ہوں گی۔ لیجیے کلام حاضر کر رہا ہوں:

میں نازاں ہوں اس پر یہ نعمت ملی
خدا کی عطا ہے، ذہانت ملی
مرا ذہن تاروں کو سوچے بہت
درخشاں نظاروں کو سوچے بہت
شب و روز کشتی بہاتا رہے
خلا کے سمندر پہ چھاتا رہے
ستاروں سے آنکھیں ملاتا رہے
خلا در خلا گیت گاتا رہے
مری فکر کی ناؤ بہنے لگی
خلائی سمندر سے کہنے لگی
مجھے اپنے روشن حصاروں میں لے
پتا مجھ کو آکاش گنگا کا دے
درخشاں ستاروں سے باتیں کروں
فلک کے نظاروں سے باتیں کروں
ملے مجھ کو دم دار تارا اگر
بنا لوں میں چپو اسے بے خطر
خلا کے سفر میں رہوں روز و شب
اجالوں کے گھر میں رہوں روز و شب

واہ واہ کی صدائیں دیر تک بلند ہوتی رہیں۔ سارے روبوٹ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ بی۔ روبو کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ وہ پروں کو پھیلائے مسلسل بھنبھناتی جا رہی تھی۔ ہر طرف آواز اور اجالوں کا حسن پھیلا ہوا تھا۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی انکل روبوٹ اور بچے چٹان سے نیچے اُتر آئے۔ انکل روبوٹ نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا ”صاحبو! اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان پیارے بچوں کو محبت و شفقت کے ساتھ الوداع کہا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خلا کے باشندے بچوں کو اپنے حصار میں لے کر آگے بڑھنے لگے۔ انکل روبوٹ نے اڑن طشتری کا دروازہ کھول دیا۔ بچے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس پر سوار ہو گئے۔ گھوں گھوں کی آواز کے ساتھ اڑن طشتری انڈرومیڈا کی پراسرار سرزمین سے پرواز کر گئی۔

اچانک ایک زوردار جھٹکا لگا اور ذہین کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی امی، سلطانہ بیگم ہنستے ہوئے کہنے لگیں ”بیٹے ذہین، تم نیند کی حالت میں بار بار کسی انکل روبوٹ کو بلا رہے تھے اور منہ سے گھوں گھوں کی آواز بھی نکال رہے تھے۔ کیا ساری رات خواب دیکھتے رہے ہو؟“

■

Khawar Naqeeb
"Tarweej", P.O: Kood, Sungra
Distt.: Cuttack - 754221 (Odisha)

کہہ مکرنیاں

(1)

دودھ دہی کی کرتی بارش
اس کی ہم پر خاص نوازش
جنگل میں چرواہا چرائے
اے سکھی، ہرنی؟
نا سکھی، گائے!

(2)

ہاتھی شیر ہیں، جوکر بھی ہیں
دیکھنے والے حیدر جی ہیں
پیٹ میں بل پڑتے ہیں ہنس ہنس
اے سکھی، جنگل؟
نا سکھی، سرکس!

(3)

کھیل کھلونے، کھیل تماشے
سرکس، موال، باجے تاشے
چٹ پٹ چاٹ کے ٹھیلے
اے سکھی، پنگھٹ؟
نا سکھی، میلے!

(4)

بانٹ رہا ہے دھوپ کی دولت
اپنے دلکش روپ کی دولت
دیکھے اس کی کوئی سج دھج
اے سکھی، چندا؟
نا سکھی، سورج!

(5)

دور خلاؤں کے جگنو رے
جلتے بجھتے ہیں انگارے
ننھے منے پیارے پیارے
اے سکھی، جگنو؟
نا سکھی، تارے!

■

Hyder Bayabani
Basera, Achalpur City
Distt.: Amravati - 444806 (Maharashtra)

احد پرکاش

جاگنے والا کچھوا

کچھوے اور خرگوش کی بھیا سُنی کہانی تم نے
کیسی اچھی مزیدار تھی بھیا سُنی کہانی تم نے
تیز دوڑنے والا تھا خرگوش جو بھیا ہار گیا
دھیرے چلنے والا کچھوا کیسے بھیا جیت گیا
یہ چھوٹی سی بات سمجھ میں بچوں کو نہیں آتی ہے
یہی بات تو ہم بچوں کو ٹیچر بھی سمجھاتی ہے
آج تلک خرگوش بچارہ سوچ رہا ہے اُس پل کو
جس پل اُس کو نیند آئی تھی کوس رہا ہے اُس پل کو
بہت گھمنڈی ہوگیا تھا وہ کیونکہ دوڑ میں اوّل تھا
غرّا تھا اس بات کا اُس کو، اس میں پھرتی اور بل تھا
اسی غرور میں تن کر رہتا، شیطانی کرتا تھا وہ
دھاک بہت تھی اُس کی بھیا نہیں کسی سے ڈرتا تھا وہ
کچھوا منزل پر پہنچا تو کیسے پہنچا یہ جانو
اس کے صبر اور ہمت کو تم بھی بچو! پہچانو
چھوڑ چھاڑ کر سونا اُس نے منزل تک جانے کی ٹھانی
محنت صبر لگن کی بچو سن لو یہ مشہور کہانی
ہر دم بچو یاد رکھو تم جیت اُسی کو ملتی ہے
جس کے دل میں جیت کی حسرت پھولوں جیسی کھلتی ہے
جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اُس کے ہاتھ نہیں کچھ آتا
جاگنے والا جو ہوتا ہے جیت کا وہ پرچم لہراتا

■
Ahad Prakash
16-Rajiv Nagar Near 12 Qtrs
Kohefiza, Bhopal - 462001 (MP)

سراج انور

کہانی

چھپے رُستم

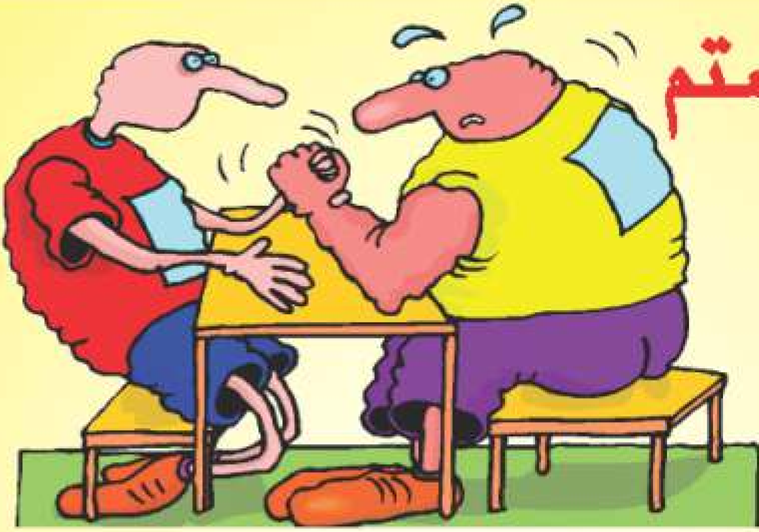

گھر میں کوئی چرخ سا دُبلا پتلا سا، ہوا میں پتنگ بنا کر اڑانے کے لائق آدمی آئے، نام دلاور خاں ہو اور جس سے ہاتھ ملاتے ہوئے صرف اس لیے ڈر لگتا ہو کہ کہیں اس کی انگلیاں نہ ٹوٹ جائیں تو بھلا انجم کے دل کی کلی کیوں نہ کھلے گی؟ جب اس نے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی اور انجم نے آکر دروازہ کھولا تو پہلی نظر میں تو وہ یہ سمجھا کہ بانس کی کھپچیوں پر کسی نے کاغذ منڈھ کر دروازے کے آگے کھڑا کر دیا ہے۔ انجم اِسے کسی کی شرارت سمجھ کر دروازہ بند کر کے اندر جانے ہی والا تھا کہ کاغذ کے اس پتلے میں سے آواز آئی۔

"اکرم صاحب ہیں کیا—؟"

انجم ان کی چوہے جیسی باریک آواز سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"میرا نام دلاور خاں ہے۔ میں اُن کا دوست ہوں۔ تم شاید اُن کے بیٹے ہو!"

"اندر آجایئے—" انجم نے مسکرا کر کہا اور پھر انھیں لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ابا دلاور خاں کا نام سن کر مسکرائے اور پھر بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں آکر ان سے ملے۔ اتوار کا دن تھا۔ انجم اور ثروت دونوں کی چھٹی تھی۔ ابا نے جب یہ بتایا کہ دلاور خاں بہت بڑے شکاری ہیں تو اُن دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ انھیں یقین نہ آیا تھا کہ پھونک سے اُڑ جانے والا یہ آدمی بہت بڑا شکاری بھی ہو سکتا ہے! محفل جمی، چائے آئی اور تب گفتگو شروع ہوئی۔

"بھئی دلاور— یار بہت دنوں میں آئے—" اکرم صاحب نے پوچھا۔

"ہاں ذرا مہاراجہ بڑودہ کے ساتھ شکار پر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے نمٹ کر گھر آرہا تھا کہ مہاراج کھام گاؤں نے بلوالیا— اُن کے ساتھ ہاتھی کے شکار پر گیا— اِس شکار کے بعد واپس آنے کی سوچی ہی تھی کہ نواب صاحب خرم نگر کا بلاوا آگیا اُن کے ساتھ شیر مارے—"

"ابا— کیا یہ صاحب اپنا کوئی خواب سنا رہے ہیں؟" انجم نے بھولے پن سے پوچھا۔

"خواب نہیں بیٹا— یہ سچے واقعات سنا رہے ہیں—"

ابا نے ہنس کر جواب دیا دلاور خاں نے سنی اَن سنی کر کے کہنا شروع کیا "بھئی اکرم تمھیں شیر کے شکار کا ایک واقعہ ضرور سنانا چاہتا ہوں"

"ضرور سنایئے ـــ" ابا کی بجائے انجم ثروت نے ایک ساتھ کہا۔ "بات یہ ہوئی کہ نواب صاحب نے تو درخت پر مچان بنالیا تھا۔ مگر میں مچان سے شیر کا شکار کھیلنے کا عادی نہیں ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ مجھے تو شیر کی بو پہلے ہی سے آجاتی ہے۔ میں نے نواب صاحب سے کہا کہ حضور تو زمین پر بیٹھ کر ہی شکار کھیلوں گا ـــ وہ جانتے تھے کہ میں کتنا بہادر ہوں۔ انھوں نے اجازت دے دی ـــ"

"پھر کیا ہوا ـــ؟" انجم نے پوچھا۔

"بیٹے ہونا کیا تھا ـــ میں سامنے ہی ایک چھوٹے سے جوہڑ کے کنارے پہنچا۔ مجھے شیر کی بو آرہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ جوہڑ کے آس پاس کوئی شیر ضرور ہوگا ـــ"

"اور شیر وہاں پر تھا ـــ" انجم نے جلدی سے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "ہاں ـــ پانی پی رہا تھا ـــ" دلاور خاں نے اپنی کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے چہرہ خوفناک بنا لیا۔ "شیر مجھے دیکھ کر دہاڑا نہیں بلکہ پانی پیتا رہا۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا اور پانی کی چھینٹیں اس کے منہ پر ماریں ـــ شیر گھبرا کر واپس چلا گیا۔"

"کمال ہے بھئی ـــ" اکرم صاحب نے مسکرا کر کہا اور دلاور خان کا یہ سنتے ہی سینہ تن گیا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں" انجم نے کہا ـــ "چڑیا گھر میں اُس شیر کی مونچھیں چھو کر میں نے دیکھی تھیں ـــ وہ ابھی تک گیلی ہیں ـــ"

ثروت ہنسنے لگی اور دلاور خاں نے پہلی بار کچھ غصے سے اور کچھ گھبرا کر انجم کو دیکھا۔ ابا کو مسکراتے دیکھ کر بھی انجم کا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ ابا خود بھی دلاور خاں سے مزا لے رہے ہیں۔

"پھر کیا ہوا ـــ؟" ثروت نے پوچھا۔

"بیٹی میں اُس کے بعد واپس آ گیا ـــ" دلاور خاں انجم کو گھور رہے تھے ـــ "جیسے ہی میں پگ ڈنڈی پر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ شیروں کی ایک پوری بٹالین راستے میں بیٹھی ہے۔"

"یہ کب کا قصہ ہے ـــ؟" انجم نے پوچھا۔

"چند مہینے پہلے کا ـــ" دلاور خاں خوش ہو گئے کیوں کہ اس بار انجم نے اُن کا مذاق نہیں اڑایا تھا ـــ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ـــ؟"

"آپ کہہ رہے تھے کہ چند مہینے پہلے کا ـــ" ثروت نے جواب دیا۔

"نہیں بیٹی میں شیر کے بارے میں کہہ رہا تھا ـــ ہاں یاد آ گیا۔ شیر لائن بنائے میرے راستے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ شیر مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایک شیر آگے بڑھا اور اس نے شیر کی ایک کھوپڑی میرے آگے ڈال دی۔ میں نے غور سے کھوپڑی کو دیکھا۔ کھوپڑی کے ماتھے پر میری بندوق کی گولی گھسی ہوئی تھی۔ میں نے گولی نکال کر دیکھی تو اس پر میرا نام اور شکار کی تاریخ لکھی ہوئی تھی ـــ"

"یہ کب کا قصہ ہے" انجم نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ مہینے گزر گئے ہوں گے اس واقعے کو ـــ بات یہ ہے کہ میں ہر گولی پر اپنا نام اور شکار کی تاریخ لکھ دیا کرتا ہوں ـــ وہی تاریخ اُس گولی پر بھی لکھی ہوئی تھی ـــ"

"پھر کیا ہوا ـــ؟" ثروت نے پوچھا۔

"پھر ہوا یہ کہ میں اس کھوپڑی کو دیکھ کر بالکل نہ ڈرا بلکہ سینہ نکال کر میں نے غصے بھری نظروں سے شیروں کو دیکھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ اصل میں یہ سب شیر اپنے اس ساتھی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں جسے میں نے ایک بار سال بن میں اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا— یہ دیکھ کر مجھے ذرا بھی فکر نہ ہوئی بلکہ میں نے کہا کہ اگر بہادر ہو تو ایک ایک کر کے آ جاؤ—

"یہ کب کا قصہ ہے؟" انجم نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمھیں بتایا تو ہے کہ چند مہینے پہلے کا پھر بھی تم پوچھے جا رہے ہو" دلاور خاں نے ذرا جز بز ہو کر جواب دیا— "اب ذرا غور سے سنو جیسے ہی شیروں نے یہ للکار سنی، وہ کھڑے ہو گئے اور پھر سب سے پہلے ان کا لیڈر آگے بڑھا۔ دور سے اس نے ایک جست لگائی اور پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں پینترا بچا گیا۔ شیر اپنے ہی وزن سے دور جا گرا۔ اس کے گرتے ہی میں نے جلدی سے اس کی دم پکڑ لی اور پھر اسے دم سے پکڑ کر چاروں طرف ہوا میں گھمانا شروع کر دیا۔ جب شیر کو چکر آ گئے تو میں نے اسے ایک چٹان سے ٹکرا کر مار ڈالا۔ اسی طرح میں نے کئی شیر مار ڈالے—"

"مجھے یقین آ گیا—" انجم نے اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"شیر لگاتار آگے بڑھتے آ رہے تھے اور میں ایک ایک کر کے انھیں مارتا جا رہا تھا— ایک بار جیسے ہی ایک شیر قریب آیا تو میں نے اس سے مذاق کرنے کی سوچی....."

"شیر سے مذاق— سبحان اللہ!" انجم نے ہنس کر کہا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں—!" دلاور خاں نے اپنے دیدے باہر نکال کر پوچھا۔

"بھئی یہ بچہ ہے تمھیں جانتا نہیں— انجم چپ رہو—" ابا نے ہنس کر جواب دیا اور پھر اسے جھوٹ موٹ ڈانٹا۔ دلاور خاں نے کچھ دیر انجم کو گھورتے رہنے کے بعد اپنی داستان پھر شروع کر دی۔ ثروت جان بوجھ کر اور قریب آ گئی تا کہ ظاہر ہو کہ دل چسپی لے رہی ہے۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا—؟"

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے شیر سے مذاق کیا—" ثروت بولی "ہاں تو جیسے ہی وہ شیر قریب آیا تو میں نے جلدی سے اس کے منہ میں اپنا سیدھا ہاتھ ڈال دیا اور پھر اس ہاتھ کو بڑھاتے میں اندر ہی اندر اس کی دم تک لے گیا۔ ذرا غور کیجیے کہ کتنا عجیب واقعہ ہے....." دلاور خاں نے چہرے پر حیرت

پیدا کر کے کہا۔

"غور کر لیا۔۔۔ آپ آگے کہیے۔۔۔" انجم سے پھر نہ رہا گیا۔

اس کے بعد میں نے اس کی دم پکڑ کر کھینچ لی۔ بالکل اس طرح جیسے ہم موزے کے اندر ہاتھ ڈال کر اسے سیدھا کر لیتے ہیں۔ شیر کے بال جسم کے اندر چلے گئے اور اس کی کھال اوپر آ گئی۔ تکلیف کے مارے وہ بلبلا گیا۔۔۔ اس کے بعد میں نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا اور وہ الٹا شیر چیخیں مارتا ہوا بھاگ گیا۔ جب باقی شیروں نے اس کا یہ حشر دیکھا تو وہ بھی دہاڑتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ گئے۔

"واہ وا۔۔۔ واہ وا۔۔۔" انجم نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔۔۔ "بہادر ہو تو ایسا ہو۔۔۔" اتنا سنتے ہی دلاور خاں نے اپنا سینہ پھلا لیا اور پھر داد طلب نظروں سے ہر ایک کو باری باری دیکھا۔ ابا تو صرف مسکرا رہے تھے، انجم کی ہنسی دکھائی دے رہی تھی "ویسے آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کب کا قصہ ہے؟" انجم نے جیسے اُن کی چڑ بتائی تھی۔ دلاور خاں نے انجم کو صرف گھور کر دیکھا جواب کچھ نہ دیا۔

"پھر تم واپس کس وقت آئے؟" اکرم صاحب نے جلدی سے پوچھا۔

"واپس تو ہم رات کو آئے مگر...." اتنا کہہ کر انھوں نے انجم کو پھر گھور کر دیکھا۔

"سنائیے سنائیے۔۔۔" انجم نے آہستہ سے کہا۔

"تمھیں معلوم ہی ہے اکرم کے جنگل میں ہم لوگ شکار کھیلنے کے لیے بیل گاڑی میں جایا کرتے ہیں۔۔۔"

"ہاں معلوم ہے۔۔۔" ابا بولے۔

"تو اس دن چونکہ ہم لوگوں کو دیر تک شکار کھیلنا تھا۔ ہم صبح کو گئے تھے اور رات کو واپس آنا تھا اس لیے ہم نے بیل گاڑی سے کھول کر ایک درخت سے باندھ دیا۔۔۔ جب رات ہو گئی اور ہمیں نواب صاحب کے محل واپس جانے کا خیال آیا تو چونکہ میں مچان سے نیچے کھڑا ہوا تھا اس لیے نواب صاحب نے مجھ سے ہی کہا کہ میں پہلے بیل کھول کر گاڑی میں جوت لوں۔۔۔ میں نے اُن کا حکم مانتے ہوئے بیل کو کھولنے کے لیے جیسے ہی اپنا ہاتھ بڑھایا تو دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ بیل اب وہاں نہیں ہے..... "مگر آپ نے اپنے ہاتھوں میں طوطے پکڑ کیوں رکھے تھے یہ آپ نے نہیں بتایا۔۔۔" انجم نے پوچھا۔

"میرے ہاتھوں میں نہیں تھے۔ میں محاورہ استعمال کر رہا ہوں، دلاور خاں نے جل کر جواب دیا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا۔۔۔؟" ثروت نے پوچھا۔

"پہلے تو میں سمجھا کہ شاید کسی شیر نے بیل کو کھا لیا ہے۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو بیل کے چلانے کی آواز ضرور سنائی دیتی۔"

"مگر وہ سنائی نہیں دی۔۔۔" انجم نے جلدی سے کہا۔

"ہاں وہ سنائی نہیں دی۔۔۔" دلاور خاں نے جواب دیا۔

آگے بڑھ کر میں نے بیل کو اندھیرے ہی میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔۔۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔۔۔"

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ہاتھ ہاتھ کو کس طرح دیکھ سکتا ہے۔ کیا ہاتھوں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں....." انجم نے بھولے پن سے دریافت کیا۔

"اوہو۔۔۔ آپ کا بچہ تو بالکل ہی ناسمجھ ہے۔ اکرم صاحب۔" دلاور خاں جزبز ہو کر بولے۔

"تم اسے کہنے دو اور آگے کہو—" اکرم صاحب نے مسکرا کر جواب دیا— "ہاں تو پھر کیا ہوا—؟"

"ابھی ہوتا کیا— میں کچھ ہی دور آگے گیا ہوں گا کہ بیل مل گیا۔ میں نے جلدی سے اسے پکڑ کر گاڑی میں جوت دیا اور پھر نواب صاحب کو آواز دی کہ اب وہ آ کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

"اب ہم آپ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ یہ کب کا قصہ ہے؟ ثروت دیدے مٹکا کر بولی:

"اچھا اچھا مت پوچھنا—" دلاور خاں اسے جھڑک کر بولے— "ہاں تو اکرم تم سنو— مزے کی بات تو اب آتی ہے— تمام رات ہم گاڑی میں چلتے رہے وجہ یہ تھی کہ ہم راستہ بھول گئے تھے— آخر جب صبح ہوئی تو ہمیں راستہ نظر آیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سب لوگ پڑے سو رہے تھے صرف نواب صاحب جاگ رہے تھے۔ میں نے انھیں جاگتے دیکھ کر ایک لکڑی زور سے بیل کے ماری مگر یہ دیکھ کر میری فاختہ اڑ گئی کہ......"

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ طوطے اُڑ گئے— اب فاختہ کہاں سے آ گئی—؟" انجم سے چپ نہ رہا گیا۔

"محاورہ بول رہا ہوں محاورہ—" دلاور خاں بری طرح جل گئے۔

"اکرم صاحب اس لڑکے کو باہر نکال دیجیے پھر سناؤں گا باقی کہانی۔" ابا نے انجم کو ڈانٹا اور پھر اسے باہر نکل جانے کو کہا۔ مگر انجم نے کہا کہ وہ تو پوری بات سنے گا کہ آخر وہ فاختہ کیوں اڑ گئی۔ دلاور خاں جب وہ بات بتا دیں گے تو وہ خود باہر چلا جائے گا۔

"اچھا سنو— تمھیں معلوم ہے کیا ہوا؟" دلاور خاں نے ہار کر کہا۔ "میں نے رات کے اندھیرے میں بیل کی جگہ کسی شیر کو پکڑ کر جوت دیا تھا— بس اب تم باہر جاؤ—"

"کمال ہے— مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے— آپ کی بہادری کا تو میں قائل ہو گیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے ویسے اگر آپ یہ بتا سکیں گے کہ یہ کب کا قصہ ہے تو میں......"

"انجم تم باہر جاؤ—" اب کے ابا نے سچ مچ اُسے ڈانٹا اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ دلاور خاں اُسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اور آنکھیں چڑھا چڑھا کر بقیہ کہانی سناتے رہے۔ کہانی سنانے میں وہ اتنے منہمک تھے کہ انھیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اُن کے پیچھے کوئی آ گیا ہے مگر ثروت نے اس چیز کو دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری۔

"شیر—!"

"ک ک ک— کہاں—" دلاور خاں ایک دم اُچھل پڑے۔ گھوم کر جب انھوں نے دیکھا تو ان کی گھگھی بندھ گئی۔ پورا جسم کپکپانے لگا اور دانتوں کی جل ترنگ بجنے لگی۔ اپنے بچاؤ کے لیے انھوں نے اپنا ایک ہاتھ وار کرنے کے انداز میں آگے بڑھا لیا۔ آنکھوں کی پتلیاں باہر نکل آئیں اور منہ سے خوفزدہ آواز میں صرف اتنا نکلا۔ ہائے میں مر گیا— اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ اپنے چچا اسلم کے ہاتھ سے مارے گئے ایک شیر کی کھال اوڑھ کر انجم دلاور خاں کو ڈرانے کے لیے اندر آ گیا تھا— اور اب کھال کو پھینک کر وہ ثروت اور ابا کے ساتھ مل کر انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا اور ابا بار بار خونخوار نظروں سے انجم کو گھور رہے تھے۔

■

اسلم آزاد

گاجر کا حلوہ

میں جب لمّاں کے کمرے میں داخل ہوا، چاروں طرف نائٹ بلب کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اماں اور میرا چھوٹا بھائی احسن گہری نیند سو رہے تھے۔ اماں رضائی میں لپٹی ہوئی تھیں اور احسن کا ایک ہاتھ اور اس کے دونوں پاؤں رضائی سے باہر تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف تیز تھیں تو میرے دل کی دھڑکنیں۔

جاڑے کی سرد رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں بہہ رہی تھی۔ کالے کالے بادل نیلے آسمان میں چھائے ہوئے تھے۔ رات کے سناٹے اور تنہائی میں چاند آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کبھی کسی بادل کی گود میں سر چھپا لیتا تو کبھی دوسرے بادل کی اوٹ میں چھپ جاتا۔ ستارے چاند کو ڈھونڈتے اور چاند ستاروں کو۔

میں جس وقت اسکول سے آیا۔ سارے گھر میں ایک مانوس خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے منھ میں پانی آ گیا۔ میں نے بستہ ٹیبل پر پھینکا اور نجمہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

نجمہ نے شوخی سے کہا

”بھائی جان! گاجر کا حلوہ“

”کہاں؟“

میں نے بے تابی سے پوچھا

”الماری میں“ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

میں خاموش ہو گیا۔

شام کی اسٹڈی میں ذرا بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔

رہ رہ کر صرف ایک خیال آ رہا تھا۔

’گاجر کا حلوہ‘

آنکھوں کے سامنے حلوے کی پلیٹ

کتاب کے صفحات پر بھی

حلوے کی تصویر۔

’گاجر کا حلوہ

گاجر کا حلوہ‘

رات کا کھانا جلد ہی کھا کر میں بستر میں گھس گیا۔

لیکن نیند کہاں؟

اور میں کروٹیں بدلتا رہا۔

سامنے دیوار پر کلاک نے گیارہ بجنے کا اعلان کر دیا۔

میں نے آہستہ سے رضائی سرکائی اور چپکے سے ننگے

پاؤں الماری کی طرف بڑھا۔ بڑی مایوسی ہاتھ لگی۔ کیونکہ الماری میں بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ اب تو نبض ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چابی اماں کے آنچل میں بندھی تھی۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔

میں نے آہستہ سے نائٹ بلب بجھا دیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ امّاں کے آنچل سے چابی حاصل کر لی۔ چپکے سے الماری کی طرف بڑھا لیکن اندھیرے میں دوسری سمت بھٹک گیا۔ کئی بار ہلکی ٹھوکریں بھی لگیں۔ قسمت نے ساتھ دیا اور میں الماری تک پہنچ گیا۔ تھوڑی کوشش کے بعد تالا ہلکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس وقت میری خوشیوں کو پر لگ گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر چاند کی دنیا کی سیر کر رہا ہوں۔ جہاں ہر طرف دودھ کی نہریں ہیں۔ امرود اور شہتوت کے ننھے ننھے درخت ہیں۔ چاکلیٹ اور ٹافی کی ڈھیر ساری دکانیں ہیں۔

بے تابی سے میں نے الماری میں ہاتھ ڈالا اور حلوے کی پلیٹ ہمارے ہاتھوں میں تھی۔ بھلا ہو چینی کی پلیٹ کا جو پھسل کر فرش پر ایک دھماکے کے ساتھ چور چور تھی۔

اماں نے گھبرا کر بڈ سوئچ آن کر دیا۔

میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

اور

میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

■

Dr. Aslam Azaad
2, Professor's Bungalow
Rani Ghat
Patna- 800 006 (Bihar)

بارش کا اب موسم آیا

بارش کا اب موسم آیا
کالی گھٹائیں ساتھ میں لایا
ابرِ بہاراں کی بوندوں سے
جل تھل سارا کوہ و سرایا
آؤ بچو ہم سب مل کر
کھیلیں کودیں اور نہائیں
بستی بستی شہر میں جا کر
پھل پھولوں کا پیڑ لگائیں
رم جھم بارش کی بوندوں کا
لگتا اچھا گیت سنانا
کبھی نہ ہو کے ننگے نہانا
رب سے لازم ہے شرمانا
اس موسم کا نام بتاؤ
رضواں سے تم تحفے پاؤ

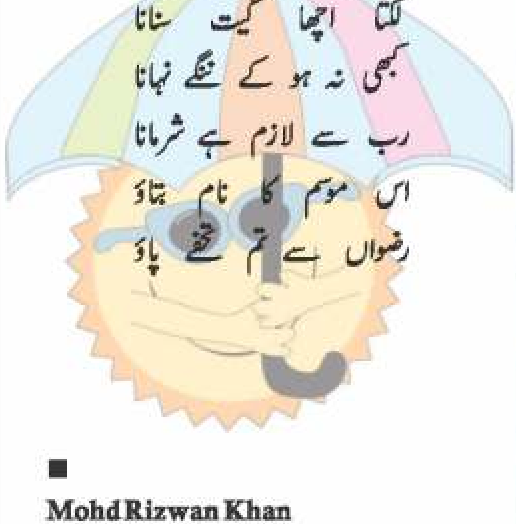

■

Mohd Rizwan Khan
D-307, MMIP, Abul Fazal Encalve
New Delhi - 110025

فیروز بخت احمد

چور کی شامت

رشید ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ بڑا ہو کر بجلی کا انجینئر بنے گا۔ وہ اکثر گھر میں آئے ہوئے بجلی کے کاریگروں کو کام کرتے ہوئے دھیان سے دیکھتا تھا۔ اس طرح وہ کافی باتیں جان گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ بجلی کا کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ربڑ کے چپل پہن لینے چاہئیں۔ ہاتھ گیلے نہیں رکھنے چاہئیں اور تاروں کو کھولنے سے پہلے مین سوئچ بند کر لینا چاہیے، وغیرہ۔ رشید بیٹری سے چلنے والی چیزیں بھی بنا لیتا تھا۔ اس نے کئی نئی چیزیں بیٹری کی مدد سے بنائی تھیں۔ اپنی کتابوں کی الماری میں اس نے بیٹری سے چھوٹی چھوٹی بتیاں لگائی تھیں جو بٹن دباتے ہی جل اٹھتی تھیں۔ اپنی سال گرہ پر اس نے بیٹری سے چلنے والی گھنٹی بھی خریدی تھی۔

ایک دن رشید نے اپنے ابا سے کہا "اس کا خیال ہے کہ وہ بجلی کا انجینئر بنے گا۔" وہ بولے "ہم تو تمھیں ڈاکٹر بنائیں گے۔" پھر انھوں نے ڈاکٹر بننے کے فائدے بتائے۔ مگر رشید تو صرف بجلی کا انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کبھی موقع آئے گا تو اپنے ابا کو بتا دے گا کہ اس میں انجینئر بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

ایک دن رشید کو اپنی صلاحیت دکھانے کا موقع مل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ اس کے ابا کی میز سے روز پین وغیرہ غائب ہونے لگے۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ رشید کے ابا اپنی گھڑی میز پر چھوڑ کر بھول گئے تو وہ بھی غائب ہو گئی پہلے ان کو شک اپنے نوکر پر گیا۔ لیکن کافی پوچھ گچھ کے بعد انھیں اطمینان ہو گیا کہ وہ چور نہیں ہے پھر ان کا شک رشید کے دوستوں پر گیا جو کھیلتے کھیلتے ان کے کمرے میں جا گھستے تھے۔ سب سے پوچھا گیا، لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ ابا نے حفاظت کے خیال سے بچوں کا اپنے کمرے میں آنا جانا بند کر دیا۔

رشید کو اپنے دوستوں میں سے صرف شاہد پر شک تھا کیونکہ وہ یہاں اس کے پڑوس میں نیا نیا آیا تھا اور اس کی عادتیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ ایک بار وہ اس کے سامنے پین چراتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

رشید کے آنگن کی دیوار چھ فٹ اونچی تھی، جس کے دوسری طرف شاہد کا گھر تھا۔ شاہد دیواریں پھاندنے اور پیڑوں پر چڑھنے کا بڑا ماہر تھا۔ آنگن کے دوسری طرف کونے میں ایک بڑا سا صندوق رکھا تھا۔ جس میں کھلونا بک ڈپو کی خوبصورت کہانیوں کی کتابیں اور 'کھلونا' کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ یہ کتابیں اور رسالے رشید کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے 'کھلونا' کے پرانے شمارے بہت پسند تھے۔ اسے جہاں بھی 'کھلونا' کا کوئی پرانا پرچہ مل جاتا وہ اسے ہر قیمت پر خرید لیتا۔ صندوق میں وہ تالا نہیں لگاتا تھا کیونکہ وہ اسے اکثر کھولتا رہتا تھا۔

ایک دن چھٹی کے روز اس کا دل چاہا کچھ مزے دار کتابیں پڑھ کر اپنا دل بہلائے۔ وہ آنگن کے کونے میں گیا۔ اس نے صندوق کھولا ہی تھا کہ اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہاں صرف دس بارہ کتابیں رہ گئی تھیں۔ باقی کتابیں اور رسالے غائب تھے۔ اس کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا اور اس نے

فیصلہ کرلیا جیسے بھی ہوگا چور کو ضرور پکڑے گا۔ اگر چور ہاتھ آگیا تو پھر اس کی وہ شامت آئے گی کہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ مگر کیسے؟ وہ چور کس طرح پکڑے؟

اس رات اسے نیند بالکل نہیں آئی۔ وہ اسی ادھیڑبن میں لگا رہا کہ چور کس طرح پکڑے۔ صندوق میں صرف آخری بار کتابیں لے جانے کو بچی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ چور ان کو ضرور لینے آئے گا۔ اس نے سوچا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جیسے ہی چور صندوق کھولے اسے پتہ چل جائے۔ اس نے نہ جانے کیا سوچا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔

اگلے دن ساری دوپہر رشید اپنے بجلی کے کھیل میں لگا رہا۔ پھر فضول کا کام کرنے کے بعد وہ کھیلنے کے لیے چلا گیا رات کو جب وہ سویا تو اس کے دل پر کسی طرح کا بوجھ نہ تھا۔

رات کے تقریباً ایک بجے اچانک گھنٹی بجی۔ رشید چھلانگ لگا کر اٹھ گیا۔ بتیاں جلا کر وہ آنگن کے کونے میں گیا تو کیا دیکھا ہے کہ چور دیوار پھلانگنے ہی والا ہے۔ جھپٹ کر رشید نے اس کو زوردار گھونسے مارنے شروع کر دیے۔ اس نے بھی رشید سے خوب مور چہ لیا مگر رشید نے اسے نہ چھوڑا۔ اس نے شور مچا کر سب کو اٹھا دیا۔ شور سن کر رشید کے اماں، ابا دونوں آگئے۔ رشید کے بڑے بھائی نے اس کو چھڑایا اور شاہد کو پکڑ لیا۔ چور رنگے ہاتھوں پکڑا جا چکا تھا۔

رشید کے ابا نے گھڑی چوری ہونے کی وجہ سے پولیس کو بلانے کو کہا لیکن شاہد معافی مانگنے لگا۔ اس نے وہ ساری چیزیں واپس دے دیں جو اس نے چرائی تھیں۔ اس نے وہ چیزیں بڑی چالاکی سے اپنے لان کی زمین میں دبا رکھی تھیں۔ رشید کو اپنے سارے رسالے اور کتابیں بھی واپس مل گئے تھے۔ شاہد کے ماں باپ نے ان سے معافی مانگی اور شاہد کو سزا دینے کو کہا۔

اس کے بعد سے شاہد کے ساتھ محلے کے دوسرے لڑکوں نے بھی کھیلنا چھوڑ دیا۔

رشید نے اپنی ترکیب ابا کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اسے انعام میں ایک نئی گھڑی دے دی جو انھوں نے پرانی گھڑی کھو جانے پر خریدی تھی۔

رشید نے یہ کیا تھا کہ اس نے بجلی کی گھنٹی اپنے کمرے کی دیوار پر لگائی اور تاروں کو دیواروں کے سہارے اس صندوق تک لے گیا جس میں کہانیوں کی کتابیں اور 'کھلونا' کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ اس نے ایک کیل صندوق کے اندر دائیں دیوار پر لگائی اور دوسری صندوق کے اندر ڈھکنے پر۔ پھر گھنٹی کے بٹن والے ایک تار کو اس کیل میں باندھ دیا۔ اس کے بعد جب اس نے ڈھکن کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو تار اور کیل آپس میں جڑ گئے اور اس کے کمرے میں گھنٹی بج اٹھی۔ رات کو شاہد نے ڈھکن کو ہلایا ہی تھا کہ رشید کے کمرے میں گھنٹی بجنے لگی اور وہ اٹھ کر چور کو پکڑنے کو بھاگا۔

شام کو جب رشید کے ابا اخبار پڑھ رہے تھے تو رشید ان کے پاس گیا اور بولا "اب آپ بتائیے آپ مجھے بجلی کا انجینئر بنائیں گے یا ڈاکٹر؟"

"بجلی کا انجینئر یعنی الیکٹرانکس انجینئر!" ابا مسکراتے ہوئے بولے۔

رشید کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔

(راقم الحروف خانوادہ مولانا ابوالکلام آزاد کے چشم و چراغ ہیں)

■

Feeroz Bakht Ahmad
A-202, Adeeba Market and Apartments
Near Rahmani Masjid, Main Road
Zakir Nagar, New Delhi - 110025

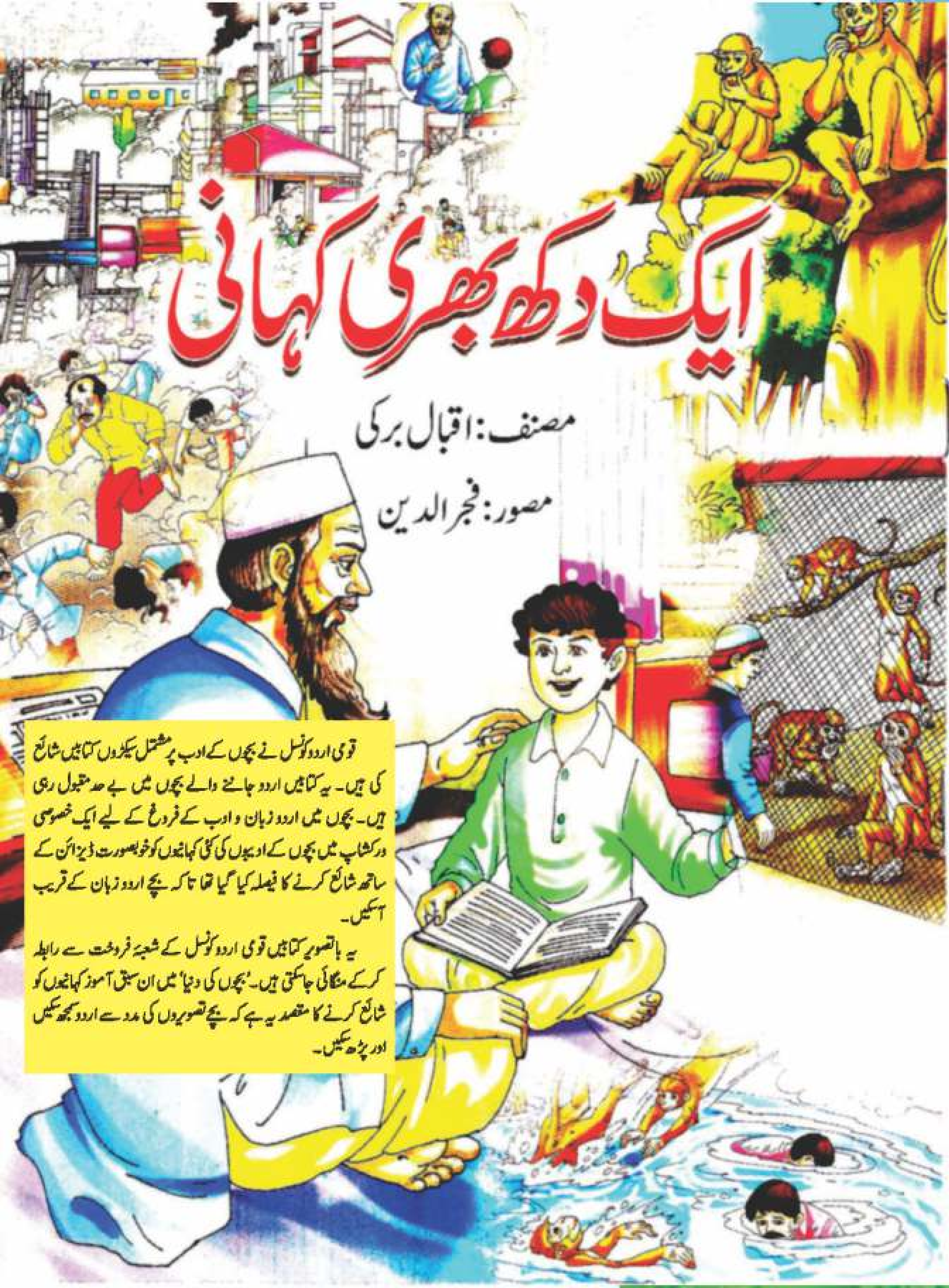

ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی

مصور: فجرالدین

قومی اردو کونسل نے بچوں کے ادب پر مشتمل سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اردو جاننے والے بچوں میں بے حد مقبول رہی ہیں۔ بچوں میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ایک خصوصی ورکشاپ میں بچوں کے ادیبوں کی کئی کہانیوں کو خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ بچے اردو زبان کے قریب آسکیں۔

یہ باتصویر کتابیں قومی اردو کونسل کے شعبۂ فروخت سے رابطہ کرکے منگائی جاسکتی ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' میں ان سبق آموز کہانیوں کو شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بچے تصویروں کی مدد سے اردو سمجھ سکیں اور پڑھ سکیں۔

’’بھیانک!......بہت بھیانک!!......ایک ایسا حادثہ کہ صرف ایک گھنٹے میں ہزاروں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے تھے..‘‘
’’ابّو! اچھی طرح بولو نا......‘‘ میری الجھی ہوئی اور جذباتی بات کو کاٹتے ہوئے اس نے مجھے ٹوکا۔
میں اس حادثہ کو سیدھی اور اپنے بیٹے کی سمجھ میں آجانے والی زبان میں دہرانے لگا۔
’’آپ جانتے ہو ہمارے پڑوس کی ایک ریاست مدھیہ پردیش بھی ہے ...... بولو تو ذرا مدھیہ پردیش کی راجدھانی کیا ہے؟‘‘
’’وہ......وہ......وہ بھوپال......بھوپال ہے نا ابّو جی......بھوپال......!‘‘
بالکل......بالکل ٹھیک......آپ کی یہ معلومات اچھی ہے۔شاباش بیٹا......

ہاں تو وہاں پر ایک بہت بڑی فیکٹری تھی .... آپ جانتے ہیں .... یہ ہمارے سامنے دیوار پر جو گھڑی لگی ہے .... ذرا بتاؤ تو یہ کیسے چلتی ہے؟"

"ابو وہ تو سیل سے چلتی ہے .... چھوٹے پینسل سیل سے!" اس نے برجستہ کہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دوبارہ رٹ لگائی، "ابو واقعہ سناؤ نا۔"

"ارے بیٹا وہی تو سنا رہا ہوں .... ہاں ٹھیک ہے یہ اپنی گھڑی سیل سے چلتی ہے .... ٹارچ بھی تو سیل سے چلتی ہے۔ لیکن شاید آپ کو نہیں معلوم کہ یہ سیل کہاں اور کیسے بنتا ہے .... ہوں تو بھوپال کی اُس بڑی سی فیکٹری میں یہی سیل بنائے جاتے تھے۔ طرح طرح کے سیل! چھوٹے بڑے، گول چوکور، ہلکے بھاری، چپٹے، باریک اور ہر قسم کے۔ لیکن ان کے بنانے کا طریقہ آسان نہیں ہے ۔ مختلف مشینوں کے مختلف کل پرزے ان پر عمل کرتے ہیں۔

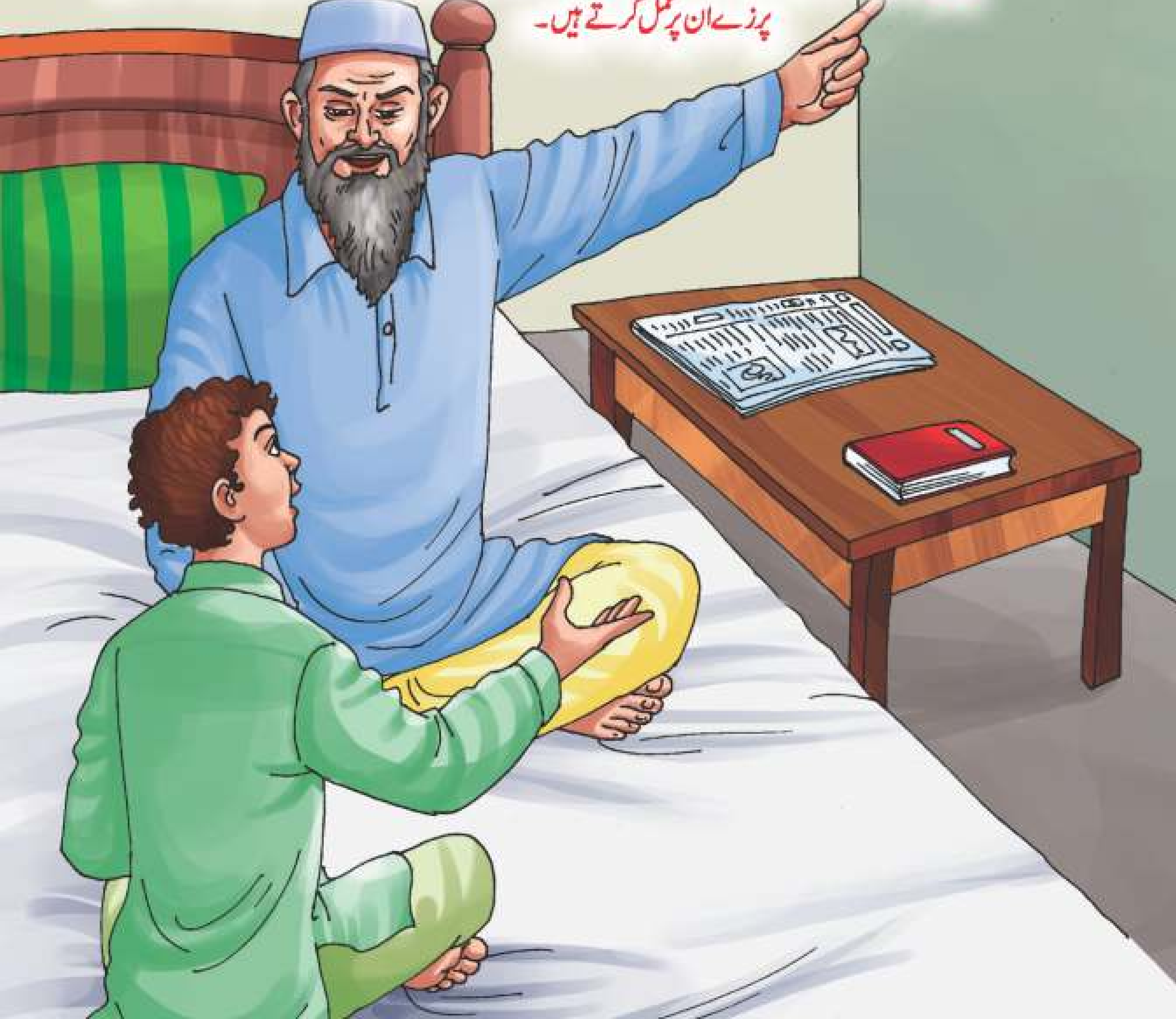

اس کے علاوہ مختلف قسم کے سامان اور کچھ مسالے بھی لگتے ہیں۔ان سب کو ایک ساتھ ملا کر ٹین کے چھوٹے ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔ پھر اس مسالے میں ایک قسم کی گیس بھی ملائی جاتی ہے .... لیکن اتنی احتیاط اور ایسی مشینوں کے ذریعے ملاتے ہیں کہ وہ گیس نہ تو اپنے سلینڈر سے اور نہ ہی کسی نلکی سے باہر آتی ہے، اور نہ ہی اُسے کسی طرح باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ٹین کا یہی خول جس میں مختلف مسالے اور یہ گیس ملائی جاتی ہے مشین ہی کے ذریعے دوبارہ بڑی احتیاط سے بند کر دیے جاتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر............ آپ واقعہ سناؤ نا............سیل مت بتاؤ............" وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔"

"ارے بابا وہی سنانے جا رہا ہوں۔ ذرا صبر بھی کرو............ ہاں تو پھر............

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ گیس جس سلینڈر میں رکھی جاتی تھی اور سلینڈر سے جو نلکی لگی ہوئی تھی، وہ کہیں سے لیک ہوگئی۔ جیسی ہمارے کچن میں ہے۔

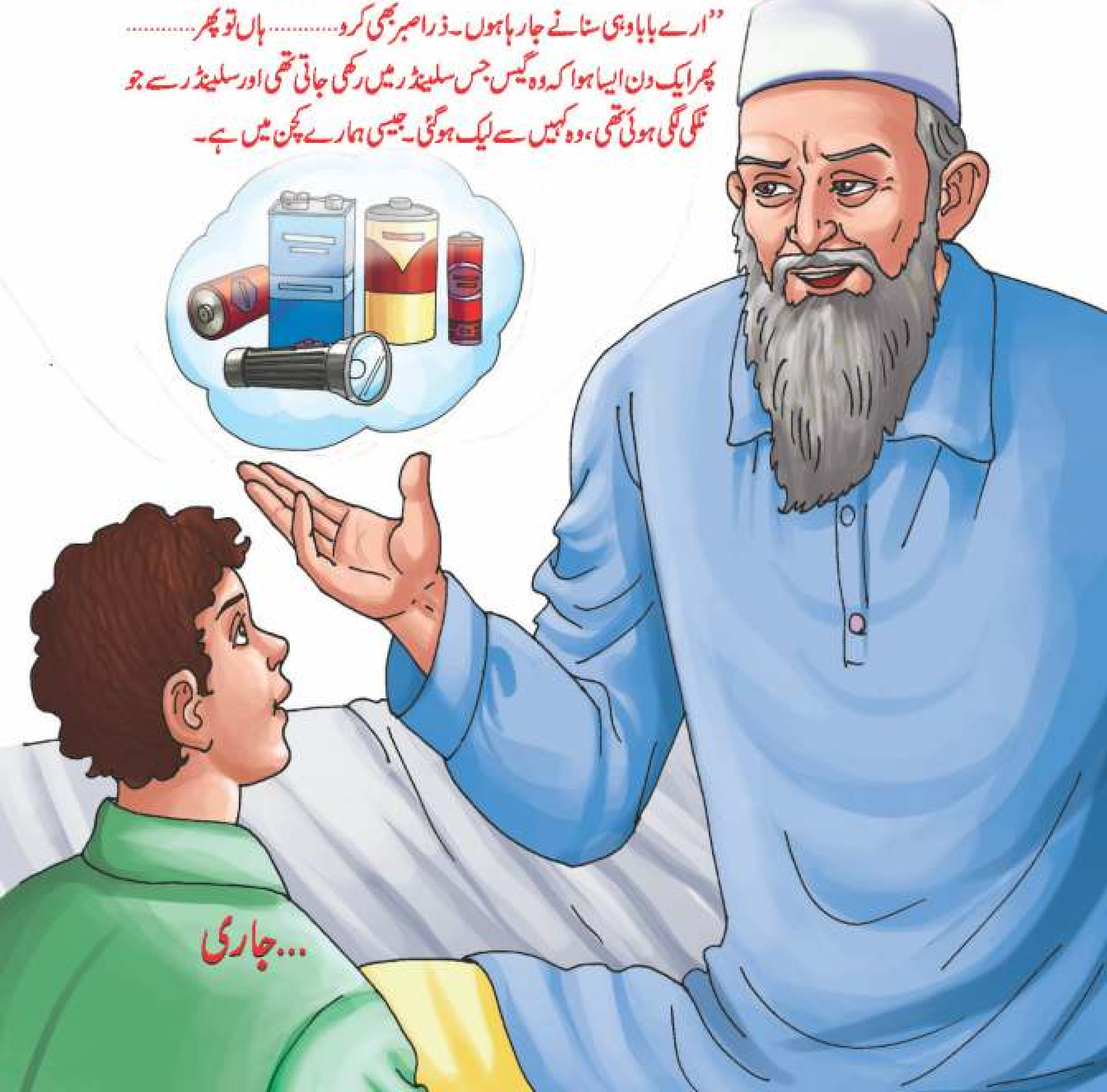

...جاری

مصنفہ: جولز ورنے
مترجم: شکیل صدیقی

قسط وار ناول

دوسری قسط

زمین کی تہہ میں

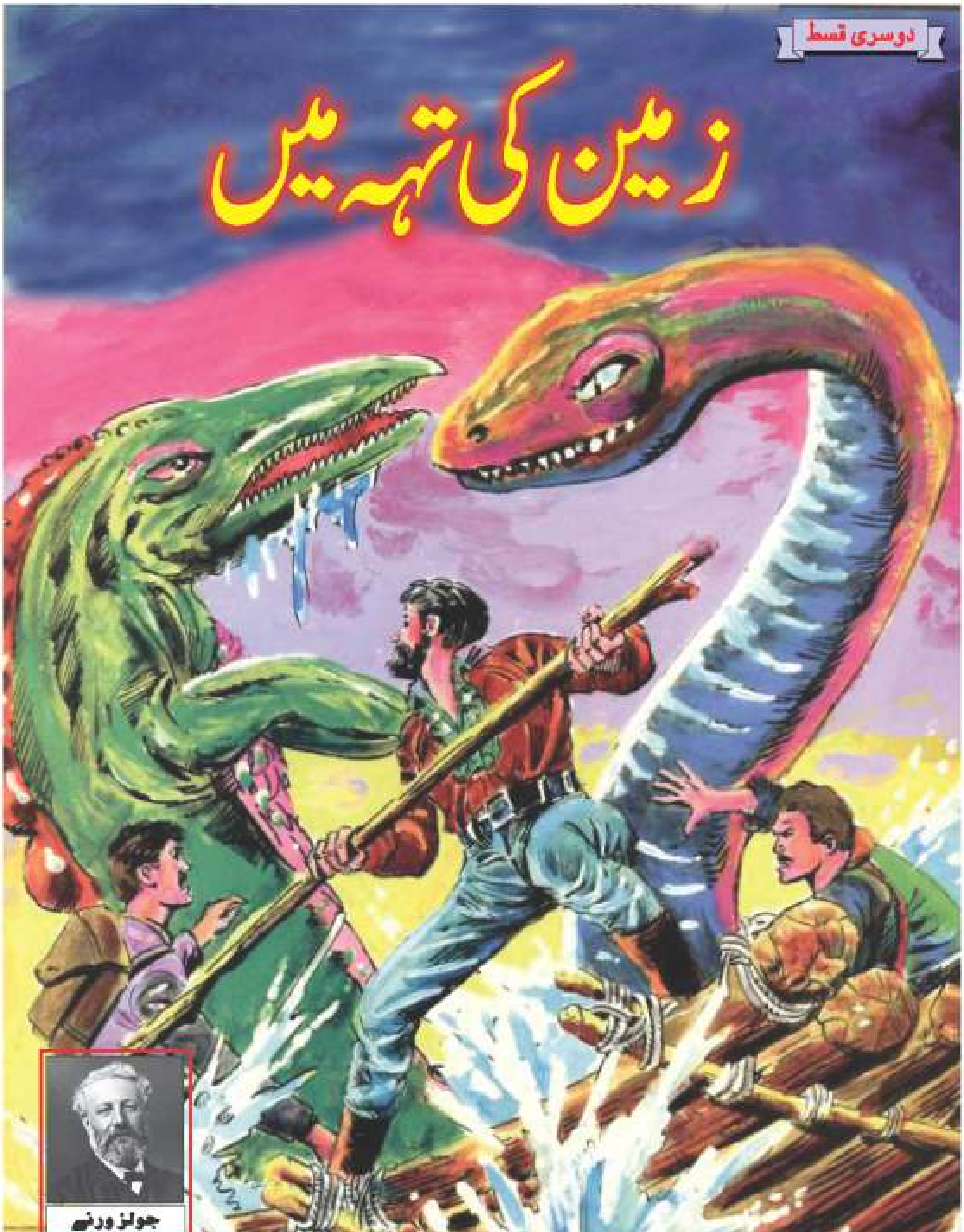

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864ء میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Around the World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے۔ جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب و غریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب و غریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔ (ادارہ)

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات و ارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ اب آگے

میں نے حل تلاش کرلیا

جاتے وقت چونکہ انھوں نے دروازہ زور سے بند کیا تھا، چنانچہ مارتھا چونک گئی اور میرے قریب آکر پوچھنے لگی "کیا وہ چلے گئے؟ آخر وہ کھانا کب کھائیں گے؟"

"وہ اس وقت کا کھانا نہیں کھائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور شام کا!"

"وہ شام کا کھانا بھی نہیں کھائیں گے مارتھا۔ جب تک وہ تحریری معاملہ حل نہیں کرلیں گے جس کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں، اس گھر کا کوئی فرد اور وہ خود کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"اوہ ڈیر! تمھارا مطلب ہے کہ ہم بھوک سے مر جائیں گے؟" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور کچن کی طرف واپس چلی گئی۔

میں نے سوچا کہ میں جولی کو جاکر ساری باتیں بتاؤں، لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ اگر پروفیسر اس دوران واپس آگئے

اور انھوں نے مجھے طلب کر لیا اور میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو کیا ہوگا؟ عقلمندی یہی تھی کہ میں گھر پر ہی ٹھہروں۔ میں نے فرانس سے آئے ہوئے پتھروں کے ذخیرے کو ترتیب سے رکھنا شروع کر دیا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میرے سر میں درد ہونے لگا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے کوئی ہولناک واقعہ رونما ہونے والا ہے!

جب وہ سب پتھر میں نے ترتیب سے رکھ دیے تو اپنا پائپ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ آخر پروفیسر کہاں گئے ہوں گے۔ وہ اس معمے کو حل کر کے لوٹیں گے یا پھر ناکام آئیں گے؟

میں نے کاغذ کا وہ پرزہ اٹھا لیا جس پر میں چچا کی ہدایت کے مطابق حروف لکھتا رہتا تھا۔ ”آخر اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟“ میں نے سوچا۔ میں دیر تک دماغ سوزی کرتا رہا، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے اس کاغذ کو الٹ دیا اور تحریر کا عکس دوسری طرف سے دیکھنے لگا۔ اس طرح سے میری سمجھ میں لفظوں کا کچھ اور مفہوم بھی آ گیا۔

اچانک یہ محسوس ہوا جیسے مجھے اس معمے کا حل مل گیا ہو! میں نے اس پرزے کو پھر پلٹ دیا اور تحریر کے ہر لفظ پر انگلی رکھ کر اس کا مفہوم اخذ کرنے لگا۔ جب میں نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ”او نہیں!“ میں نے خود کلامی کے انداز سے کہا۔ میرے چچا کو اس بارے میں نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اگر انھیں اس سفر کے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر وہ یہ سفر خود کرنا چاہیں گے۔ انھیں کوئی طاقت نہیں روک سکے گی اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہیں گے لیکن ہم واپس نہیں آ سکیں گے۔ نہیں، کبھی نہیں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت ذہنی طور پر کتنا پریشان تھا!

میں نے سوچا اگر میرے چچا نے اس تحریر پر غور و خوض کیا تو وہ بھی اس کا مفہوم سمجھ لیں گے۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ میں اس پرانی تحریر کو ضائع کر دوں۔ اسٹڈی میں آگ روشن تھی۔ میں نے کاغذ کا وہ پرزہ اور آرنی کی وہ کتاب اٹھالی۔ پھر میں وہ دونوں چیزیں شعلوں کی نذر کرنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میرے چچا اسٹڈی میں داخل ہوئے۔

میں نے سہم کر دونوں چیزیں پھر سے میز پر رکھ دیں۔

چچا جان نے میری طرف دیکھے بغیر اس تحریر پر پھر غور کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے قلم اٹھایا اور جمع

تفریق کرنے لگے۔ اس میں تین گھنٹے گزر گئے مگر ان کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ سورج غروب ہو گیا اور ہر طرف سناٹا چھا گیا، مگر چچا جان اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس معمے کو حل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس تحریر کو سیکڑوں طریقوں سے حل کیا جا سکتا تھا اور وہ ہر طریقہ آزما رہے تھے۔

اس دوران مارتھا کھانے کو پوچھنے بھی نہیں آئی۔ میں سو گیا۔ جب دوسری صبح اٹھا تو میں نے پروفیسر کو بدستور اس معمے میں الجھے دیکھا۔ وہ اس تحریر کا مفہوم ابھی تک نہیں سمجھ سکے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ، گال زرد اور بال الجھ چکے تھے۔

ان کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا مگر میں نے انھیں اس الجھن کا حل نہیں بتایا اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ وہ لازماً سفر کرنا چاہیں گے اور ایسا معرکہ انجام دینا چاہیں گے جو اب تک کسی ماہر ارضیات نے انجام نہیں دیا۔ انھیں اس تحریر کا مفہوم بتانا بالکل ایسا ہی تھا جیسے انھیں خودکشی کرنے کا آسان طریقہ بتا دیا جائے۔

چنانچہ میں خاموش رہا، مگر اپنے معدے کو بھول گیا۔

مارتھا صبح کو بازار نہیں جا سکی اس لیے کہ پروفیسر صدر دروازے کو لاک کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اب ناشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی بھوک پر قابو پائے خاموش بیٹھا رہا۔ بارہ بجے کے قریب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے مگر میں ضبط کیے رہا۔ البتہ جب دو بج گئے تو میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ پروفیسر اس سفر کا خطرہ مول لے لیں، انھیں تحریر کا مفہوم بتا دیا۔

میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ تمام لفظوں سے پہلا حرف لے کر انھیں الٹی ترتیب سے پڑھیں۔ پروفیسر نے اس طرح سے پڑھا تو خوشی سے چیخ پڑے۔ تحریر کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا:

یوکل کے سنیفلز کے دہانے میں اتر کر نیچے جاؤ
جہاں کہ اسکارٹرس کا سایہ پڑتا ہے
دلیر مسافر، یکم جولائی سے پہلے
پھر تم زمین کے مرکز تک پہنچ جاؤ گے
میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ آرنی

چچا جان خوشی سے اچھلنے لگے۔ کبھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگے، کبھی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتے۔ انھوں نے کئی کرسیاں ادھر ادھر کیں، اپنے قیمتی پتھر ہوا میں اچھالے اور پھر ایک آرام کرسی میں گر گئے۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"تین بجے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اوہ کیا واقعی؟ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں اور اس کے بعد....."

"اس کے بعد؟"

"تم میرا بوریا بستر لپیٹنا"

"اور اپنا۔ اور اپنا بھی۔" انھوں نے کہا اور کمرے کی طرف چلے گئے۔

ان کے احکام سن کر میں لرز گیا۔ زمین کے مرکز تک پہنچنے کا خیال کیسی دیوانگی تھی، مگر میں نے اپنی دلیلیں اور اعتراضات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے اور کھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

چچا جان نے دروازہ کھولا تو مارتھا بازار گئی اور سودا سلف خرید کر لے آئی۔ پھر اس نے ایک گھنٹے میں کھانا تیار کر دیا تو

ہم نے مل کر کھایا۔ کھانے کے بعد چچا نے مجھے پھر اسٹڈی میں چلنے کو کہا۔

"البرٹ۔" انھوں نے ملائمت سے کہا۔ "تم ایک ہوشیار اور نوجوان لڑکے ہو۔ ہمیں جلد ہی ایک بڑی خوشی حاصل ہونے والی ہے، جس میں تمھارا بھی حصہ ہوگا۔"

میں نے سوچا کہ اس وقت ان کا موڈ اچھا ہے لہٰذا ان سے اس خوشی کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔

"اس کے علاوہ تم ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرنا۔ سائنس کے شعبے میں میرے جو دوست ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھا لیں گے چنانچہ تم سفر سے واپسی تک اپنا منہ بند رکھنا۔" وہ بولے۔

"کیا کوئی دوسرا بھی اس سفر کو کرنا چاہے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً دوسرے ماہر ارضیات آرنی کے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔"

"چچا جان مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت نہیں ہے کہ آرنی نے ایسا کوئی سفر کیا ہے۔ یہ مذاق بھی ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم اسے دیکھ لیں گے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"مگر آپ مجھے اس کی اجازت دیجیے کہ میں ساری دشواریاں بیان کروں۔"

"ہاں ضرور لڑکے۔ تمھیں اس کی اجازت ہے، اس لیے کہ تم اب میرے پارٹنر ہو۔"

"سب سے پہلے تو یہ کہ سینی فلزیکل اور اسکارٹرس کا کیا مطلب ہوا؟"

"یہ معلوم کرنا تو بہت آسان ہے۔ کتابوں کے شیلف کے چوتھے خانے سے اٹلس نکال کر لے آؤ۔"

میں نے شیلف سے اٹلس نکال کر چچا کو دیا تو انھوں نے اسے کھولا۔

"یہ آئس لینڈ کا سب سے اچھا نقشہ ہے۔ اس جزیرے پر جتنے بھی آتش فشاں ہیں ان کے ناموں کے ساتھ یوکل لگا ہوا ہے جس کا مطلب ہے گلیشیر۔ برف کی موٹی تہہ کے نیچے دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور آتش فشاں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔"

"لیکن سینی فلز؟"

مجھے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی کہ ان کے پاس اس کا بھی جواب تھا۔

"یہ آئس لینڈ کا مغربی ساحل ہے میں اس پر انگلی رکھ رہا ہوں اب اسے دیکھتے رہنا۔ یہ دارالحکومت رکیاوک ہے...... اس کے آگے کیا ہے؟"

"خشکی کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی ہڈی کی طرح نکلا ہوا ہے، مگر آخر میں پچکا ہوا سا ہے۔"

"اس پچکے ہوئے حصے کے قریب کوئی اور چیز ہے؟"

"ایک پہاڑ ہے۔"

"یہ سینی فلز ہے۔ یہ پانچ ہزار فیٹ بلند ہے اور اگر اس کا دہانہ واقعی زمین کے مرکز تک جاتا ہے تو پھر یہ ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ ناممکن ہے" میں نے کہا۔ مجھے زمین کے مرکز تک پہنچنے کا خیال نہایت احمقانہ لگا۔

"ناممکن؟ ناممکن کیوں؟" پروفیسر نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ آتش فشاں کے دہانے سے دہکتی ہوئی چٹانیں اور پگھلا ہوا لاوا نکل رہا ہوگا اور......"

"مگر سینی فلز ایک مردہ آتش فشاں ہے۔ آخری بار یہ

1229 میں پھٹا تھا۔"

میں اس موضوع پر ان سے بحث نہ کر سکا۔

"پھر اسکارٹرس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اور اس میں یہ کیوں لکھا ہے یکم جولائی سے پہلے؟"

چچا جان چند لمحوں تک سوچنے کے بعد بولے "سینی فلز کے بہت سے دہانے ہیں اور آرنی یہ بتانا چاہتا تھا کہ کس دہانے سے زمین کے مرکز تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یکم جولائی سے پہلے اس پہاڑ کی چوٹی کا سایہ ٹھیک اس دہانے پر پڑے گا۔ اس لیے جب ہم سینی فلز کی چوٹی پر پہنچیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔"

چچا جان کے پاس چونکہ آرنی کے تحریری پیغام کے سارے سوالوں کے جواب تھے اس لیے میں نے سائنسی اعتراضات کرنا شروع کردیے۔

"ٹھیک ہے مجھے اعتراف ہے کہ یہ تحریر واضح ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ آرنی، سینی فلز گیا ہوگا۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس کا سایہ بھی کسی دہانے پر پڑتے دیکھا ہوگا، مگر وہ اس دہانے سے زمین میں نہیں اترا۔ وہاں سے زندہ سلامت واپس آگیا...... اوہ نہیں خدایا وہ نیچے جا ہی نہیں سکتا تھا۔"

"کیوں نہیں جا سکتا تھا؟" چچا نے ناخوشوار لہجے میں کہا۔

"اس لیے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سطح زمین سے ہر ستر فیٹ نیچے جانے کے بعد درجہ حرارت ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی بڑے سوراخ سے زمین کے نیچے اس کے مرکز تک پہنچ جائیں تو وہاں ہمیں ہر ایک چیز گیس کی حالت میں ملے گی جس کا درجہ حرارت تقریباً بیس لاکھ درجے ہوگا۔"

"البرٹ! تم درجہ حرارت کی وجہ سے پریشان ہو؟"

"جی ہاں، مجھے یہ بات پریشان کررہی ہے۔"

"تم کو اندیشہ ہے کہ نیچے پہنچ کر تم پگھل جاؤ گے۔ مگر تم یا کوئی دوسرا شخص یہ نہیں جانتا کہ زمین کے اندر کیا ہے۔ ایک خاص گہرائی میں پہنچنے کے بعد درجہ حرارت بڑھنے کے بجائے کم کیوں نہیں ہوجائے گا؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''اس کے علاوہ۔'' انھوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''سائنس دانوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر زمین کے مرکز کا درجہ حرارت ہیں لاکھ درجے ہوتا تو اب تک پیدا ہونے والی گیس پھٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیتیں اور یہ حقیقت ہے کہ زمین کی اندرونی حرارت روز بہ روز کم ہو رہی ہے اس لیے کہ شروع میں دنیا میں جتنے آتش فشاں تھے، اب نہیں ہیں۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔''

''مگر ایک بڑا سائنس داں بہر حال مجھ سے متفق ہے۔ ایک انگریز کیمیاں داں ہمفرے ڈیوی 1825 میں مجھ سے ملاقات کرنے آیا تھا اس نے کہا تھا کہ زمین میں جو گرمی ہے وہ اس کی سطح گرم ہونے کی وجہ سے ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ زمین کے مرکز میں کسی حدت کا وجود نہیں ہے۔ بہر حال آرنی کی طرح ہم بھی اس کا مشاہدہ کر لیں گے، لیکن اس کے بارے میں ابھی اپنی زبان نہ کھولنا، ورنہ ہم سے پہلے کوئی اور وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور ہمارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔''

تیاری

میں چچا جان کی اسٹڈی سے نکل آیا۔ گھر میں مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی، اس لیے میں دریا کی طرف چلا گیا۔ کیا چچا واقعی زمین کی تہہ تک سفر کرنے والے تھے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا تو میں اس سڑک کی طرف چل پڑا، جہاں جولی سے ملاقات ہونے کا امکان تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے آتی دکھائی دی۔

''البرٹ مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ سے ملاقات کرنے آرہے تھے۔'' وہ حیرت سے بولی۔ پھر اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو اس نے کہا۔ ''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ''ہاں ٹھیک ہے'' میں نے جواب دیا۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہی۔ معلوم نہیں اس کے دل کی کیا کیفیت تھی۔ وہ میرے دل کی طرح دھڑک رہا تھا یا پر سکون تھا، بہر حال یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔

''البرٹ!'' اس نے بالآخر کہا۔ ''یہ سفر بے حد سنسنی خیز رہے گا۔ ایک سائنس داں کا بھتیجا ہونے کی حیثیت سے، بے حد مناسب!''

''کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو جولی؟ کیا تم مجھے یہ مشورہ نہیں دو گی کہ میں یہ سفر نہ کروں؟''

''نہیں البرٹ اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو تم دونوں کے ساتھ اس سفر میں شریک ہوتی۔''

جولیا کے اس طرح باتیں کرنے سے مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے اس سفر پر جانے سے روکتی وہ خود جانے پر آمادہ تھی۔ بہر حال، یکم جولائی ابھی کافی دور تھی اور ممکن تھا کہ چچا اس وقت تک زمین کی تہہ میں اترنے کا فیصلہ تبدیل کر دیتے۔

جب ہم کنگس اسٹریٹ والے مکان پر پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں تو توقع کر رہا تھا کہ وہاں خاموشی چھائی ہوئی ہو گی اور چچا جان معمول کے مطابق اپنی خواب گاہ میں ہوں گے۔ لیکن میں نے انھیں چند آدمیوں کے درمیان کھڑے ہاتھ ہلاتے اور چیختے چلاتے دیکھا۔ وہ لوگ مکان سے سامان باہر نکال رہے تھے اور مارتھا گھبراہٹ میں ادھر ادھر دوڑتی پھر رہی تھی۔

"جلدی کرو البرٹ" چچا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "تم نے میرے کاغذات ترتیب سے نہیں رکھے اور مجھے اپنے بیگ کی چابی بھی نہیں مل رہی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ میں کوئی بھیانک خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ چچا اس سفر پر جانے کے لیے تیار ہیں۔

"کیا ہم واقعی جارہے ہیں؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں لڑکے یقیناً ہم پرسوں صبح جائیں گے۔"

میں دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ چچا جان سفر پر جارہے ہیں اس لیے کہ انھوں نے سفر میں استعمال ہونے والی ضروری چیزوں کی خریداری کرلی تھی۔ راہداری میں رسیاں، سیڑھیاں، لالٹین اور کلہاڑیاں وغیرہ پڑی تھیں۔

اس رات میں اچھی طرح سے سو نہ سکا۔ دوسرے دن صبح ہی جولی نے مجھے جگادیا۔ "پیارے البرٹ اٹھو"

میرا خیال تھا کہ میری سرخ آنکھیں اور زرد چہرہ دیکھ کر جولی کو مجھ سے ہمدردی ہوجائے گی اور وہ اس بارے میں اپنا خیال تبدیل کردے گی کہ مجھے بھی چچا کے ساتھ سفر پر جانا چاہیے۔

"اوہ رات بھر آرام کرنے کے بعد تمھاری حالت کافی بہتر ہوگئی ہے۔" وہ بولی۔

"بہتر ہوگئی ہے!"

"البرٹ۔" جولی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پروفیسر سے طویل گفتگو کی ہے۔ وہ بہت باحوصلہ آدمی ہیں اور یاد رکھو کہ ان کا خون تمھاری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔ انھوں نے مجھے وضاحت سے اپنا منصوبہ بتایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں اس سفر میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اوہ البرٹ وہ دن کتنا پُرمسرت ہوگا جب پروفیسر بروک اور اس کے ساتھی اس سفر سے واپس آئیں گے۔ تم ایک تجربے کار شخص بن چکے ہوگے۔ تقریباً ان کے برابر۔ تم اپنے تجربات سے لوگوں کو آگاہ کروگے اور تمھیں اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہوگی۔" کہتے ہوئے اس کا چہرہ مسرت سے

سرخ ہو گیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔

اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم لوگ جارہے ہیں۔ میں جولی کے ساتھ پروفیسر کی اسٹڈی میں گیا۔

"چچا جان میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر آپ کو جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ آج صرف 26 مئی اور....."

"احمق کہیں کے۔ کیا یہاں سے آئس لینڈ جانا آسان ہے؟ کوپن ہیگن سے مہینے میں صرف ایک جہاز کیاوک کو جاتا ہے اور وہ بھی 22 تاریخ کو۔"

"پھر؟"

"پھر اگر ہم 22 جون تک انتظار کرتے رہے تو آتش فشاں کے دہانے پر اسکارٹرس کا سایہ پڑتا نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس لیے ہمیں جلد از جلد کوپن ہیگن پہنچنا چاہیے تاکہ وہاں سے کوئی جہاز مل سکے۔ جاؤ اور جاکر اپنا سامان باندھو۔"

میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جولی نے ضروری چیزیں ایک بکس میں بند کردیں۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے غصہ آرہا ہے لہٰذا وہ خاموش تھی۔ میرا غصہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ میں نیچے چلا گیا۔ وہاں سارے دن ضروری سامان اور بندوقیں وغیرہ آتی رہیں۔ مارتھا بے چاری اس سامان کو حفاظت سے رکھتی جارہی تھی۔

"کیا پروفیسر دیوانے ہو گئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جارہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا تہہ خانے میں؟" پرانی خادمہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس سے بہت نیچے۔" میں نے کہا۔

جب رات ہو گئی تو چچا جان نے کہا۔ "اب صبح تم سے ملاقات ہوگی۔ ہم لوگ چھ بجے یہاں سے چل دیں گے۔"

میں اپنے کمرے میں جاکر بستر پر گر گیا۔ رات بھر مجھے ایسے خواب آتے رہے کہ جیسے میں زمین میں پڑے ہوئے بڑے بڑے شگافوں میں اتر رہا ہوں۔ چچا جان کا طاقتور ہاتھ مجھے گڑھے میں کھینچ رہا ہے اور میں مسلسل گر رہا ہوں۔

میں نے صبح پانچ بجے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے اور نیچے گیا۔ چچا جان میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے انھیں ناگواری سے دیکھا۔ جولی وہاں موجود تھی اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتہ میرے حلق سے نہیں اتر سکا۔

ساڑھے پانچ بجے ایک گھوڑا گاڑی آگئی۔ جس میں سامان سمیت ہمیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ جب گاڑی میں سامان رکھا جاچکا تو چچا جان نے گھر کی چابیاں جولی کے حوالے کردیں۔ پھر جولی نے چچا جان کا الوداعی بوسہ لیا۔ جب وہ مجھ سے مصافحہ کررہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"جاؤ البرٹ جاؤ۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جب تم واپس آؤ گے تو میں تم سے شادی کرلوں گی۔

میں اور چچا جان گاڑی میں بیٹھ گئے تو جولی اور مارتھا نے دروازے سے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ پھر کوچوان نے سیٹی بجائی تو گھوڑے اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر دوڑنے لگے۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)
مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بڑے لوگ بڑی باتیں

حکیم بوعلی سینا

دل آزاری سب سے بڑی مصیبت ہے۔

زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اتنا کھاؤ جتنا ہضم کرسکو۔ اتنا پڑھو جتنا جذب کر سکو۔

بہترین قول ذکر ہے، بہترین فعل عبادت ہے اور بہترین خصلت علم ہے۔

بیماروں میں سب سے بری بیماری دل کی ہے اور دل کی بیماریوں میں سب سے بری دل آزاری ہے۔

قلت عقل کا اندازہ کثرت کلام سے ہوتا ہے۔

تلوار توپ اور بندوق سے اتنی خلقت نہیں مرتی جتنی کہ بسیار خوری سے مرتی ہے۔

انسان کی بہترین خصلت علم ہے۔

بغیر بھوک کے غذا نہ کھائیں اور جب بھوک تیز ہوجائے تو بھوکے نہ رہیں۔ جو شخص انتقام کے طریقوں پر غور کرتا رہتا ہے اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

فقیر وہ ہے کہ اس کی خاموشی فکر کے ساتھ ہو اور اس کی گفتگو ذکر کے ساتھ ہو۔

نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔

حکیم لقمان

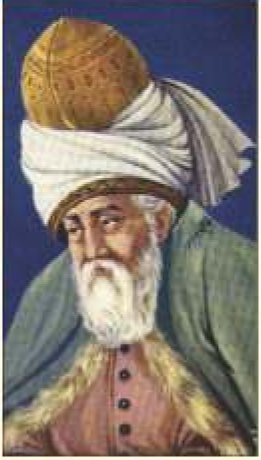

اگر کوئی کام کسی کے سپرد کرے تو دانا کے سپرد کر، اگر دانا میسر نہ ہو تو خود کر ورنہ ترک کردے۔

لوہے کا ایک کلہاڑا لکڑی کے جنگل سے ایک چھلکا نہیں اتار سکتا۔ جب تک اس کے ساتھ لکڑی کا دستہ شامل نہ ہو۔

جاہلوں کی صحبت سے پرہیز رکھ، ایسا نہ ہو کہ تجھے اپنے جیسا بنالیں۔

جس نعمت میں کفران ہے، اس کو بقا نہیں اور جس نعمت میں شکر ہے اس کو زوال نہیں ہے۔

بدگمانی کو اپنے اوپر غالب مت کر کہ تجھے دنیا میں کوئی ہمدرد نہ مل سکے۔ جو کام کر خدا کے لیے کر، اس میں بندوں کا خوف نہ کر۔

اگر لوگ تجھے اس صفت کے ساتھ موصوف بتلائیں جو کہ تیری ذات میں نہ ہو تو ان کی تعریف سے مغرور مت ہوجا کیونکہ جاہلوں کے کہنے سے ٹھیکری سونا نہیں بن جاتی۔

مصائب دنیا کو سہل خیال کر اور موت کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

حکیم افلاطون

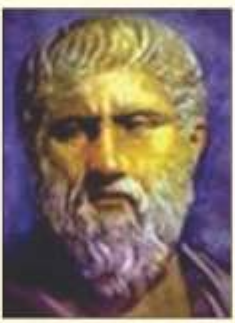

انسان کا فخر اس میں ہے کہ فخر نہ کرے اور باوجود بڑا ہونے کے اپنے آپ کو کمتر خیال کرے۔

جو شخص لوگوں سے کنارہ کشی کرتا ہو، تو اس سے مل اور جو شخص لوگوں سے ملنے کا عادی ہو اس

سے کنارہ کشی کر۔

نیکی میں اگر تجھے رنج پہنچے، تو رنج تو نہ رہے گا، فعل نیک رہ جائے گا، گناہ میں اگر لذت حاصل ہو تو لذت تو نہ رہے گی فعل بد البتہ باقی رہ جائے گا۔ طالب علم سے شرم مناسب نہیں، کیونکہ جہالت شرم سے بدتر ہے۔

خدائے کریم کے تمام عطیوں میں سے حکمت سب سے بڑھ کر ہے اور حکیم وہ شخص ہے جس کے قول و فعل دونوں یکساں ہوں۔

اچھی بات کو حاصل کرنے کے لیے بری بات کو ذریعہ و وسیلہ نہ بنانا چاہیے۔

جو شخص لوگوں کو عمل صالح کی ہدایت کرے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی اندھے شخص نے ہاتھ میں چراغ پکڑا ہو اس سے وہ دوسروں کو تو روشنی دے اور خود نہ دیکھ سکے۔

ہر روز اپنا منہ آئینے میں دیکھا کرو، اگر بری صورت ہے تو برا کام نہ کرو تاکہ دو برائیاں جمع نہ ہوں۔ اگر اچھی صورت ہے تو اس کو برا کام کر کے خراب نہ کرو۔

جس شخص میں غور و فکر کرنے کی عادت ہے وہ اپنی روح سے دوبدو کلام کرتا ہے۔

دنیا کو چوروں کی کمین گاہ تصور کر کے ہوشیاری اور آگاہی کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔

اہل علم کا امتحان اس کی کثرت علم پر نہیں ہوتا بلکہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فتنہ انگیز باتوں سے کس طرح بچتا ہے۔

غصہ کی مقدار بات چیت میں اتنی ہونی چاہیے، جیسے کھانے میں نمک کہ جب تک اندازہ پر رہتا ہے تو ہاضم ورنہ فاسد۔

اطبا کی سب سے بڑی چوک یہ ہے کہ وہ ذہن کی طرف توجہ دیے بغیر علاج کرنے لگتے ہیں۔

دنیا عاقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔

سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے۔

معاشرے میں رہنے والے ہر شخص سے اس کی اہلیت، صلاحیت اور گنجائش کے مطابق کام لیا جائے اس طرح ہر شخص کو خوشیاں نصیب ہوں گی اور ہر شخص خوش حال ہوگا۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ عقل و فراست رکھتا ہے لیکن ہر شخص عقل و فراست سے کام نہیں لیتا۔

انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔ بڑے کاموں سے نہیں کہ وہ بڑے کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کی طبیعت کے رجحان کے خلاف ہوتے ہیں۔ برے آدمی اچھی باتوں میں بھی برائی ڈھونڈتے ہیں، جس طرح مکھی سارے جسم کو چھوڑ کر زخم پر آ کر بیٹھتی ہے۔

کام کو جلدی کرنے کی فکر نہ کرو، بلکہ بہتر طور پر انجام دینے کی فکر کرو، لوگ یہ نہ پوچھیں گے تم نے یہ کام کتنے وقت میں کیا۔ وہ تمہارے کام کی عمدگی دیکھیں گے۔

خدا پر اعتقاد کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

خدا ہر طائر کو خود خوراک دیتا ہے مگر اس خوراک کو گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔

خاموش رہنے میں ہی انسان کی سلامتی ہے۔

■

بشکریہ: اقوال زریں، اقبال سا ہر لائبریری، بھیڈ

فاطمہ النساء لیاقت اللہ خاں

دوستی: ایک اٹوٹ رشتہ

زندگی میں ہر رشتہ اپنی ایک الگ ہی اہمیت رکھتا ہے۔

روزمرہ کے ان رشتوں میں سے ایک رشتہ ہے "دوستی کا۔"

دوستی ایک خوبصورت احساس ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسے ناپنے کا کوئی پیانہ نہیں ہے۔ نہیں جانو تو کچھ نہیں اور جانو تو بہت کچھ۔ دوستی، رنگ، نسل، امیری، غریبی، جنس اور عمر کو دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ یہ تو کسی سے بھی کی جاسکتی ہے۔ جہاں پر دو لوگوں کے خیالات ملنے لگتے ہیں وہیں سے دوستی کے اس خوبصورت سے رشتے کی شروعات ہوتی ہے۔

ویسے تو میرا Friends circle بھی بڑا ہے۔ یہ بہترین دوست یعنی Best Friends چنندہ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ میری بھی دو تین Best Friends ہیں جن سے میں بہت سارا پیار کرتی ہوں ان میں سے ایک غوثیہ ہے۔

جب پریشانیوں کے سمندر میں زندگی کی ناؤ غوطے کھا رہی تھی تب زندگی میں پہلی بار اپنوں اور پرایوں میں فرق سمجھ میں آیا۔ تب زندگی میں ایک بار پھر سے میرا دوستی کے اس خوبصورت سے احساس سے سابقہ پڑا اور مجھے اپنی اس دوستی پر ناز ہے۔ یہ دوستی ہر قدم پر میرا ساتھ دیتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "اچھا دوست ایک پھول کی مانند ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے اور توڑ بھی نہیں سکتے۔ توڑ دیا تو مرجھا جائے گا اور چھوڑ دیا تو کوئی اور لے جائے گا۔"

دوستی کا رشتہ سچ اور بھروسہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ ہر کسی کی زندگی میں کوئی Best Friends ہوتا ہے۔ اس رشتہ کے ساتھ ہمیشہ ہمیں انصاف کرنا چاہیے کیونکہ یہ ان رشتوں میں سے ایک رشتہ ہے جو صرف دینا جانتا ہے۔ بدلے کی توقع نہیں کرتا۔ ہمیں اپنی زندگی میں ہر رشتہ ایمانداری اور سچائی سے نبھانا چاہیے۔

لیکن ضروری ہے کہ دوست اچھا ہو۔ دوستی میں پر خلوص رہنا ضروری ہے مگر کبھی کبھی دوست کے اخلاص کو بھی آزمانا چاہیے۔ یہ ضروری ہے۔

دوستی اسی سے کرنی چاہیے جو آپ کو اچھی صحبت دے نا کہ برائی کی طرف راغب کریں۔ دوست دو طرح کے ہوتے ہیں اچھے اور برے۔ لیکن ایک اچھا دوست ہزار برے دوستوں سے بہتر ہے۔

اپنے دوست کے کام آکر دوستی کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اپنی دوستی کی ڈور کو اتنا مضبوط کیجیے کہ غلط فہمیاں اور حالات کے اتار چڑھاؤ اس پر اپنا اثر نہ ڈال سکیں کیونکہ "وقت دوست اور رشتے یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں مفت میں ملتی ہیں مگر ان کی قیمت کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ کھو جاتی ہیں۔"

■

Fatemunnisa D/o Liyaqatullah Khan
Shah Colony, Nanded Road, Unarkhed
Distt: Yewatmal - 445206 (Maharashtra)

شہزاد عالم اعظمی

میٹھے بول

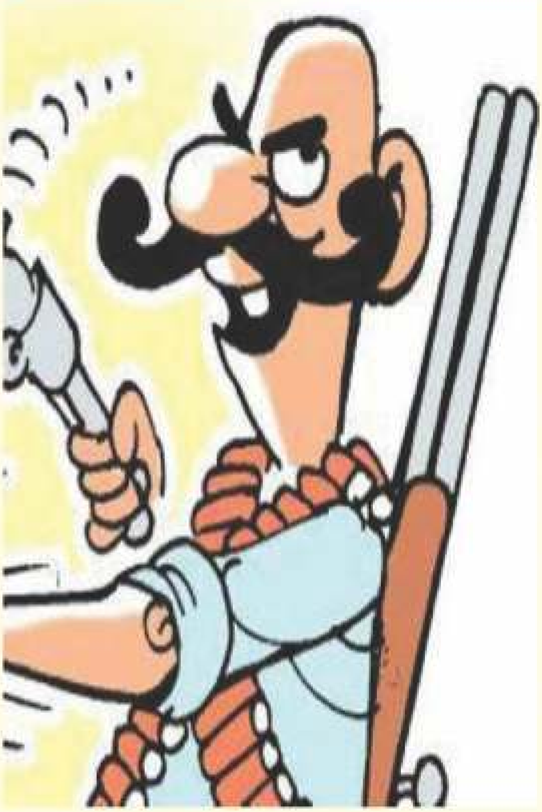

جگت پور گاؤں میں ایک ڈاکو رہتا تھا۔ اس کا نام بھورا تھا۔ وہ بہت زیادہ لوٹ مار کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے۔

اسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی، شوہر کا انتقال ہو گیا تھا، صرف ایک بچی تھی۔ اس بچی کی شادی طے ہوئی۔ شادی کی تیاریاں جگت پور کی روایت کے مطابق دھوم دھام سے شروع ہوئیں، جہیز کا سامان تیار ہو چکا تھا زیورات بن چکے تھے۔ جو بحفاظت ایک بکس میں بند تھے۔ شادی کے دن آئے، رت جگا شروع ہوا، پاس پڑوس کی لڑکیاں، لڑکی کا دل بہلانے کے لیے اس کے کمرے میں رہنے لگیں۔

اس شادی کی خبر 'بھورا' کو بھی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اچھا موقع ہے آسانی سے زیورات اور روپیہ ہاتھ آ سکتا ہے۔ بھورا نے بندوق کندھے پر رکھی اور چل دیا، آدھی رات ہو چکی تھی، لڑکیاں ابھی گا بجا رہی تھیں، بوڑھی ماں انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور انتظامات میں لگی ہوئی تھیں، گھر میں بوڑھی عورت اور لڑکیوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، بھورا دروازے پر پہنچا، اس نے کنڈی بجائی، اندر سے آواز آئی: کون صاحب؟ اس نے جواب دیا بھورا۔ 'بھورا' کا لفظ جگت پور کے لوگوں کے لیے ایک بھیانک لفظ تھا۔ لڑکیوں نے سنا تو کانپنے لگیں بعض چھت پر چڑھ کر دوسرے مکانوں میں کود گئیں، جو رہ گئیں ان کے ہوش و حواس اڑ گئے، کچھ بے ہوش ہو گئیں اور ان کا برا حال ہو گیا۔

بوڑھی عورت نے دیر نہیں کیا، لڑکیوں سے کہا گھبراؤ مت، دل میں کچھ سوچ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور نہایت اطمینان سے دروازہ کھول دیا، سامنے بھورا کندھے پر بندوق رکھے کھڑا تھا، بوڑھی عورت نے جیسے ہی بھورا کو دیکھا آگے بڑھی اور بڑے پیار کے ساتھ کہا "ارے بیٹا" تو اس وقت کیسے آ گیا، اچھا اندر آ! آتا کیوں نہیں؟ اور یہ کہہ کر بھورا کا ہاتھ پکڑا، ارے تو کیا سوچ رہا ہے؟ چل اندر، آج کچھ کھایا ہے کہ نہیں، بچیوں نے بڑی اچھی کھیر پکائی ہے، بوڑھی عورت یہ کہہ رہی تھی اور بھورا کا حال یہ تھا کہ بالکل سکون سے کھڑا تھا، نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا، بوڑھی عورت بھورا کو اندر لے گئی اور پلنگ پر بٹھایا بھورا بیٹھ گیا اور نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا، عورت باورچی خانہ کی طرف گئی اور کھیر کے ساتھ کچھ مٹھائی اور پھل

لے کر آئی، اور بولی بیٹا! تو ضرور بھوکا ہے، لے کچھ کھا لے، ارے تو پہلے سے کیوں نہیں آیا؟ تجھے روکنے والا کون ہو سکتا ہے؟ ہاں بیٹا! میرے شوہر کے مرنے کے بعد سب نے ساتھ چھوڑ دیا، اگر تو نے آنکھیں پھیر لی تو کیا ہوا، کون کس کا ہوا ہے، بیٹا! اسی کا نام دنیا ہے۔

"ماں" یہ میری بندوق رکھ دو اور یہ کہہ کر اس نے دو تین چمچے کھیر کھائی، اور اٹھنے لگا، بوڑھی عورت نے میٹھے بول کا وار پھر کیا اور کہا بیٹا! کھاتا کیوں نہیں؟ دیکھو چہرے پر کیسی بے رونقی ہے اور یہ مٹھائی اور پھل کس لیے چھوڑ دیے، بھورا بوڑھی عورت کو ماں کہہ چکا تھا اور اب ماں کی بات سے انکار کرے تو کیسے کرے۔ اس لیے کچھ مٹھائی اور پھل کھالیا اور بولا ماں! اب اجازت دیجیے، کل آؤں گا اور یہ کہہ کر بندوق اٹھائی اور چلا گیا۔ بوڑھی عورت کے پیارے پیارے میٹھے بول بھورا کے دل پر جادو کی طرح اثر کر گئے اور وہ کل ہو کر صبح آیا اور شادی کا سارا انتظام بھورا نے اپنے سر لے لیا اور نہایت خوبصورتی سے وہ شادی ہوئی۔

پیارے بچو! دیکھا آپ نے کہ بوڑھی عورت کے میٹھے بول نے ایک برے آدمی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ اس لیے لوگوں سے ہمیشہ میٹھے بول ہی بولنا چاہیے، اور کڑوے بول سے بچنا چاہیے۔

لیجیے آپ کی خدمت میں علامہ اقبال کا اک شعر لکھ دیتا ہوں جو اس کہانی پر بالکل صادق آتا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

■

Shahzad Alam Azmi
Jamia Islamia Banspar
Bahurwa Belthara Road
Ballia - 221715 (UP)

پہیلیاں

سر کے اوپر نیلی جھیل
جس میں مچھلی جیسی چیل
بولو بوجھ کیا ہے یہ
کوئی ساگر یا زنبیل؟

☆

شب میں چمکتے سارے ہیں
دیکھنے میں یہ تارے ہیں
دیپ سے جلتے بجھتے ہیں
آخر کیا یہ پیارے ہیں؟

☆

منزل منزل جاتی ہے
بل کھاتی لہراتی ہے
دور سے اس کو دیکھو تو
سانپ سمجھ میں آتی ہے

☆

پی کے سیاہی پلتا ہے
منہ سے لفظ اگلتا ہے
بوجھ کیا ہے یہ جس کے
بن نہیں پر چلتا ہے

☆

لی جاتی، دی جاتی ہے
کبھی یہ توڑی جاتی ہے
پیٹ نہیں بھرتا اس سے
لیکن کھائی جاتی ہے

■ جوابات اگلے شمارے میں۔

■

Meraj Ahmad Meraj
At Nichygram, Po.: Kulti - 713343 (West Bengal)

آؤ اردو سیکھیں

بچو! دوچشمی 'ہے' (ھ) سے بننے والے حروف بھی ساتھ ساتھ سیکھتے چلو۔ یہ بھی اردو کی بنیادی آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔

बच्चो! दोचश्मी 'हे' से बनने वाले हुरूफ़ भी साथ साथ सीखते चलो। ये भी उर्दू की बुनियादी आवाज़ों को ज़ाहिर करने वाले हुरूफ़ हैं:

ب+ھ=بھ
پ+ھ=پھ
ت+ھ=تھ
ٹ+ھ=ٹھ

'बे' (ب) + ھ = भे (بھ)
'पे' (پ) + ھ = फे (پھ)
'ते' (ت) + ھ = थे (تھ)
'बे' (ٹ) + ھ = ठे (ٹھ)

بھ سے بھالو؛ بھالا؛ بھنڈی؛ بھاڑ؛ بھینس

भे (بھ) से भालू; भाला; भिंडी; भाड़; भैंस

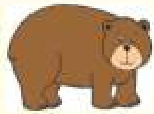

پھ سے پھل؛ پھول؛ پھاٹک؛ پھانسی؛ پھاوڑا

फे (پھ) से फल; फूल; फाटक; फाँसी; फावड़ा

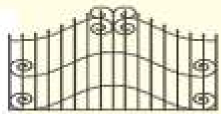

تھ سے تھالی؛ تھانہ؛ تھیلا؛ تھن؛ تھوتھنی

थे (تھ) से थाली; थाना; थैला; थन; थूथनी

ٹھ سے ٹھڈی؛ ٹھیلا؛ ٹھونگ؛ ٹھٹیرا؛ ٹھوڑی

ठे (ٹھ) से ठुड्डी; ठेला; ठोंग; ठटेरा; ठोड़ी

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اگلے شمارے میں تلاش کریں

شفق اسعد بنت اسعد اعظمی

مضبوط سہارا

''امّی جان! آپ کہاں ہیں؟ جلدی سے آئیں اور یہ دیکھیں میں کیا لایا ہوں۔'' نوفل شور مچاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ راحیلہ بیگم بھاگی چلی آئیں۔ اور جلدی سے بولیں: ''کیا بات ہے بیٹا؟ کیوں اتنا شور مچا رہے ہو؟ میرا دل ہول رہا ہے۔ بولو کیا بات ہے؟'' ابھی ان کی بات بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ نوفل نے پورے کا پورا رس گلا ان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ اس اچانک مصیبت پر گھبرا کر رہ گئی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ جو نوفل اتنا خوش ہو رہا ہے اور ان کو اتنی ساری مٹھائیاں کھلائے جا رہا ہے۔ کیوں کہ اپنے والد کی حادثاتی موت کے بعد وہ کبھی اس طرح خوش نہیں ہوا تھا اور وہ اتنے عرصے میں اسے پہلی بار اتنا خوش دیکھ رہی تھیں۔

''امی جان! مجھے ایک امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر میں ملازمت مل گئی ہے۔'' نوفل کی آواز ان کو خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ ''آں ہاں! کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟'' ''اوہ کم آن امی جان! آپ پھر خیالوں کی دنیا میں چلی گئیں۔ میری خوشی کو انجوائے کیجیے اور خوش ہو جایئے کہ اب آپ کا بیٹا آپ کا سہارا اور آپ کا بازو بن گیا ہے۔ اب میں آپ کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔ اب آپ آرام کیجیے۔'' نوفل کی محبت سے بھرپور آواز سن کر وہ اپنے سارے غم بھلا بیٹھیں۔ اسی طرح جب وہ غمگین ہو جاتیں تو نوفل کی محبت بھری آواز ان کے لیے آب حیات ثابت ہوتی۔ اور وہ اپنے سارے غم بھول جاتیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد اب وہ ہی تو ان کا سہارا تھا۔ اسی کے لیے تو وہ اب تک جی رہی تھیں۔ اللہ کے بعد اس کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کب کا خود کو فنا کر ڈالتیں لیکن اسی کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ دن بھر گھر کے کاموں میں الجھی رہتیں اور راتوں کو جاگ کر لوگوں کے کپڑے سلتی تھیں اور جو مزدوری ملتی تھی اس سے بمشکل گزارہ ہو رہا تھا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں نے تو شوہر کے انتقال کے بعد ان سے ناطہ توڑ لیا تھا کہ کہیں وہ ان سے کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ لیکن انھوں نے اپنی خودداری کی وجہ سے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا اور بہت تنگی و عسرت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔

راتوں کو دیر دیر تک جاگ کر کپڑے سلنے کی وجہ سے ان کی بینائی کمزور ہو چکی تھی اور ان کی آنکھوں پر ایک عدد موٹے شیشوں والے چشمے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ نوفل جب تھوڑا بڑا ہوا اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ محنت سے کام کرتے ہوئے دیکھا وہ سوچتا تھا کہ میری ماں میرے لیے کتنی محنت کرتی ہے۔ راتوں کو جاگ کر اپنی نیندیں

خراب کر کے مجھے تعلیم یافتہ بنانے کے لیے کپڑے سلتی ہے۔ خود بھوکی رہ جاتی ہے اور میرے منھ میں نوالہ ڈالنے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو اس کا بازو بنوں گا، اس کو سہارا دوں گا اور میں خود کام کروں گا اور اسے آرام کرنے دوں گا اور اس کی اتنی خدمت کروں گا کہ مجھ سے خوش ہو جائے۔

جب نوفل اسکول جانے لگا تو اس کا خرچ مزید بڑھ گیا۔ اس کو بھی راحیلہ بیگم نے قبول کر لیا۔ لیکن انھوں نے نوفل پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ مگر اس کے لیے انھیں مزید محنت کرنی پڑی اور ایسے وقت میں ان کی تعلیم کام آئی اور انھوں نے محلے کے بچے بچیوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا جس سے ان کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ٹیوشن سے ملنے والے پیسوں کو وہ نوفل کی تعلیم پر خرچ کرتی تھیں۔ نوفل بہت ذہین بچہ تھا۔ وہ ہر سال اپنی کلاس میں اول آتا تھا۔ اسی طرح تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے نوفل گریجویشن میں جا پہنچا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ ایک طرف اپنی تعلیم بھی جاری رکھے گا اور دوسری طرف کوئی اچھی سی نوکری کر کے وہ اپنی ماں کو معاشی فکروں کے بوجھ سے آزاد کر دے گا۔

اس نے ایک مقامی کالج میں پرائیویٹ ایم اے کے لیے فارم بھر دیا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ وہ روز اخبار میں نوکری کے اشتہارات دیکھتا اور درخواستیں لکھ کر اپنے ڈاکومنٹس کے ساتھ بھیجتا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک جگہ سے اسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ وہ انٹرویو دینے کے لیے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد انٹرویو کے لیے آئی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا کہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان میرا سلیکشن کیسے ہوگا؟ لیکن اس کو اپنے رب سے قوی امید بھی تھی کہ وہ اس کی مشکل ضرور آسان کرے گا۔ جو لوگ انٹرویو لے رہے تھے وہ اس کے اخلاق، شرافت اور قابلیت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے خیال میں اس پوسٹ کے لیے اس سے موزوں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس کو سلیکٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ انٹرویو دے کر آیا تو اگلے ہی روز اس کو اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر موصول ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ اس نے راحیلہ بیگم کو اس سارے واقعے کی بھنک بھی نہ لگنے دی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اسے نوکری مل گئی تو وہ انھیں سرپرائز دے گا۔ اب جب کہ اسے نوکری مل گئی تھی اور اسے اگلے دن سے آفس بلایا گیا تھا تو اس نے سوچا کہ اگلے دن آفس سے واپسی پر وہ اپنی پیاری امی کو مٹھائی کھلا کر انھیں اس سارے واقعے سے باخبر کر دے گا جس سے وہ ابھی تک لاعلم تھیں۔

اسی لیے آج آفس سے واپسی پر وہ مٹھائی لیتا آیا اور انھیں مٹھائی کھلا کر ساری حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت کے مارے گنگ ہو گئیں۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئیں تو کہا: ''بیٹا! کیا ضرورت تھی ابھی سے ان چکروں میں پڑنے کی؟ پہلے اپنی تعلیم تو مکمل کر لیتے پھر تو ساری زندگی یہی کرنا تھا۔'' ''اُفوہ امی جان! آپ بھی ناں، آپ اور کتنی محنت کریں گی، اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' نوفل کا محبت بھرا لہجہ ان کے کانوں میں شہد گھول رہا تھا اور انھیں لگ رہا تھا کہ آج ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا اور انھیں ان کے صبر اور محنت کا صلہ مل گیا۔ ان کا بیٹا ان کا مضبوط سہارا بن گیا تھا۔

■

Shafaque Asad D/o Asad Aazmi
B.18/1 G, Reori Talab,
Jamia Salafia Marg
Varanasi-221010 (U.P)

مریم جمیلہ بنت مرزا عبدالقیوم ندوی

پکنک

امتحان کے بعد اسکول کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ ہم سب خوب مزے کرنے لگے، ہماری کالونی کا میدان کافی ہرا بھرا تھا، جہاں کالونی کے سارے بچے سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ میں بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی کھیل رہی تھی۔ میری سہیلیوں کے نام زینب، انابیہ، شہونہ، بصیرا اور تنزیلہ ہیں۔ ہم سب آپس میں بہت ہی خوش و خرم رہا کرتے ہیں اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں اور خوب کھیلتے بھی ہیں۔ چھٹیوں میں ہم سب ایک جگہ جمع ہوئے اور ہم نے کہیں جانے کا پروگرام بنایا۔ میں نے طے کیا کہ اس بار ہم شہر سے قریب دولت آباد کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع فارم ہاؤس پر جائیں گے اور صرف ہم لوگ ہی جائیں گے، گاڑی میری طرف سے ہوگی۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور یہ بھی طے پایا کہ کل صبح جلدی نو بجے فارم ہاؤس کے لیے نکلیں گے۔ ہم سب نے اپنے اپنے ممی پاپا کی اجازت اور پیسے لے کر میرے گھر آنے ٹھیک نو بجے آنے کا وعدہ کیا اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن صبح نو بجے سب وقت پر میرے گھر جمع ہوگئے اور گاڑی بھی وقت پر آگئی تھی۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ کر فارم ہاؤس کی طرف چل دیے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے خوب مزا

کیا، مستی کی، سوئمنگ پول میں نہایا۔ میں اپنے ساتھ میرے بھائی مرزا ابوالحسن علی کا موبائل فون لے کر آئی تھی، میں نے اپنی سہیلیوں کی خوب تصویریں کھینچیں۔ فارم ہاؤس میں رنگ برنگ کے پھول، پودے اور بہت سارے پھل دار درخت بھی تھے، جن میں قابلِ ذکر آم، امرود، آنار، انجیر اور شریفے کے پیڑ بھی تھے۔ پھولوں پر رنگ برنگی سیکڑوں تتلیاں منڈلا رہی تھیں، ہم نے انھیں پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر ہمارے ہاتھ

ایک بھی تتلی نہیں آئی۔ ہم سب بہت خوش تھے، خوب اچھل کود کر رہے ہیں جب ہم کھیل کود کر تھک گئے تو ہم نے اپنے ساتھ لایا لنچ باکس کھولنے کا فیصلہ کیا اور سب نے اپنے اپنے بیگ میں سے کھانے کا باکس نکالا، سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ آئس کریم پارلر کی طرف چل دیے اور سب نے مل کر آئس کریم خریدی اور خوب مزے لے کر کھائی۔ پھر ہم آرام کے لیے وہاں بنے ایک خوبصورت مکان میں گئے، جہاں ہم نے ایک گھنٹہ آرام کیا۔ پھر دوبارہ گارڈن میں آکر کھیلنے لگے۔ کھیلتے کھیلتے ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب شام کے پانچ بج گئے، میں نے فوراً گاڑی والے انکل کو آواز لگائی کہ انکل چلیے اب ہم بہت تھک گئے ہیں اور شام بھی ہونے کو ہے۔ ہم سب نے کچھ پیسے گاڑی والے کو دیے اور ان سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بہترین کیک خرید کر لائیں، ہم سب نے مزے لے کر کیک کھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے اور جب ہم گھر میں داخل ہو رہے تھے تو مغرب کی نماز کی اذان ہو رہی تھی۔ گھر پر ابو امی شدت سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے میں نے خوب مزے لے لے کر باجی، بھیا، امی اور ابو کو فارم ہاؤس میں گزارے دن بھر کی تفصیل بتائی وہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ابو سے کہا آئندہ سال ہم سالانہ چھٹیوں میں کشمیر جائیں گے۔ ابو نے مسکرا کر جواب دیا، جی بیٹی ضرور جائیں گے۔

■

Maryam Jameela
D/o Mirza Abdul Qayyum Nadvi
Mirza World Book House, Qaisar Colony
Aurangabad 431001 (Maharashtra)

جوابات

جواب: آسمان، جگنو، ریل، قلم

ہنسی کے غبارے

ایک قیدی دوسرے قیدی سے۔ تم سے کوئی ملنے نہیں آتا۔ کیا تمھارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟

دوسرا قیدی: ہیں تو بہت سارے لیکن خدا کے کرم سے سارے اسی جیل میں ہے۔

ایڈیٹر (امیدوار سے) تو تم نے پروف ریڈر کے عہدے کے لیے اپلائی کیا ہے۔ جانتے ہو یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے؟

امیدوار: (ایڈیٹر سے) جی سر اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ جو بھی غلطی کریں گے اس کی غلطی میرے سر آئے گی اور میں چپ رہوں گا۔

ایک ٹھیکیدار صاحب کسی محکمہ میں کام نکلوانے کے لیے ایک افسر کو کار کی پیش کش کر رہے تھے۔ افسر نے متانت سے کہا "جناب، یہ رشوت ہوگی اور میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

لیکن سنیے تو! ٹھیکیدار صاحب نے لجاجت سے کہا "میں یہ کار آپ کو مفت تو نہیں دے رہا، آپ مجھے اس کار کے عوض دس روپے دے دیں۔ اب تو یہ رشوت نہیں ہوگی۔ یہ تو خرید و فروخت کا سیدھا سا معاملہ ہے۔

افسر نے چند لمحے غور کیا اور پھر یوں گویا

"ایسی صورت میں تو میں دو کاریں خریدوں گا!!!

ایک درزی کو گاہکوں کا کپڑا چوری کرنے کی بہت بری عادت تھی، ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کا دن ہے اور اس نے گاہکوں کے جو ٹکڑے چرائے تھے، ان سب کا ایک بہت بڑا جھنڈا بنا ہوا ہے جسے فرشتے درزی کے سینے میں گھونپ کر کھڑے ہیں اور بار بار پوچھ رہے ہیں۔

"بتاؤ کپڑا چوری کرو گے؟"

اور درزی کی خوب پٹائی کر رہے ہیں۔

اگلی صبح درزی اٹھا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی، دکان پر جا کر شاگرد سے کہا۔

"میں جب کسی گاہک کا کپڑا چوری کرنے لگوں تو تم مجھے صرف یہ کہہ دینا کہ "استاد جی، وہ جھنڈا۔"

سو جب بھی درزی کوئی کپڑا چوری کرنے لگتا تو شاگرد کہتا "استاد جی، جھنڈا۔"

ایک دن اس درزی کے پاس ایک بہت خوب صورت کپڑا آیا اور اس نے کپڑے کا ٹکڑا کاٹ کر جونہی چھپانا چاہا، شاگرد بولا۔

"استاد جی، جھنڈا۔"

استاد غصے سے بولا۔ "بکواس بند کرو، یہ رنگ جھنڈے میں نہیں تھا۔"

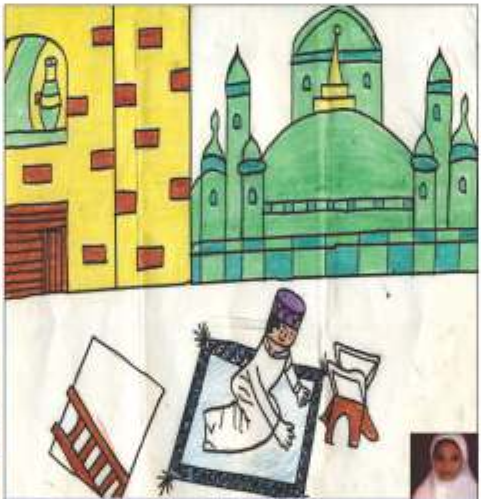

سیدہ اریبہ نایاب سید منیر الدین، درجہ ہشتم
فاطمہ گرلس ہائی اسکول، بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

عرشیان عقیل کھاتمک، درجہ ہفتم، شیخ امام پری پرائمری اسکول

انعم ثنا، درجہ سوم، کانٹنڈ کڈس اکادمی، دربھنگہ بہار

رابعہ، درجہ ہفتم، ہڑی برہمنہ، ضلع سامبا، جموں و کشمیر

مبشرہ پروین مرزا مظہر بیگ، زیڈ پی اردو اپر پرائمری اسکول، کارنجا روڈ، ضلع واشم، مہاراشٹر

ثانیہ صدف محمد جمیل، زیڈ پی اردو اپر پرائمری اسکول، کارنجا روڈ، ضلع واشم، مہاراشٹر

facebook اردو فیس بک

2 سال 'بچوں کی دنیا' کا ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔ نئے الفاظ و معانی، ضدین اور الفاظ کا سلسلہ جاری رکھیں۔

معین خان، چالیس گاؤں، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' نے ہمیں تو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ نظمیں اور کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔

عرفات جہاں، درجہ: پنجم، تہذیب اردو اسکول، چالیس گاؤں، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

میری خواہش ہے کہ میں پڑھ لکھ کر ٹیچر بنوں اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں۔ میں ٹیچر بن کر لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک ٹیچر ہی سماج کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔ میں علم کی روشنی گھر گھر پہنچانا چاہتی ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا میں کہانیاں، لطیفے، قصہ حاتم طائی وغیرہ بہت اچھے لگتے ہیں۔ سچ سچ میں 'بچوں کی دنیا' ایک قابل تعریف رسالہ ہے۔

مصباح عابد شیخ، درجہ: ہفتم، اسکول ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، بگھاڑی

میری یہ خواہش ہے کہ میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں لیکن اب میری خواہش ہے کہ میں ایک ڈاکٹر بنوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ مریضوں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے میرے استاد نے بتایا ہے کہ خواب دیکھنا چاہیے اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ خواب پورا ہوگا اور ہاں مجھے بچوں کی دنیا بہت پسند ہے۔

اقرا شیخ عابد، درجہ: ششم، اسکول ضلع پریشد، اردو اسکول، سبھاش نگر، بگھاڑی

میرا نام محمد معاذ ہے۔ میں بچوں کی دنیا تقریباً دو سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے۔

محمد معاذ اشفاق احمد، درجہ: ہشتم، مالیگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' ایک ایسی دنیا ہے جس میں مذہبی، سائنسی، اخلاقی، معلومات کا خزانہ ہے۔ دنیا کی رنگ برنگی تصاویر، دل کو چھو لینے والی کہانیاں اور نظمیں بہت پسند آتی ہیں۔

انعم جہاں یونس خان، ضلع پریشد اردو اسکول دھانورہ، ضلع جلگاؤں

میں صبغت اللہ بن عاصم احمد صدیقی جامعہ اثریہ دارالحدیث مئوناتھ بھنجن ضلع مئو میں پرائمری درجہ چہارم میں پڑھتا ہوں مجھے آپ کی میگزین 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ اس کے تمام مضامین کہانیاں، بچوں کا فیس بک، لطیفے، نظمیں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

صبغت اللہ بن عاصم احمد صدیقی، مکان نمبر 8، محلہ پورہ باز، مئوناتھ بھنجن، یوپی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

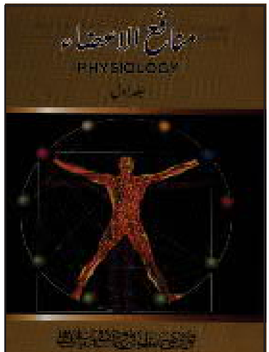

صفحات: 581، قیمت: 445 روپے

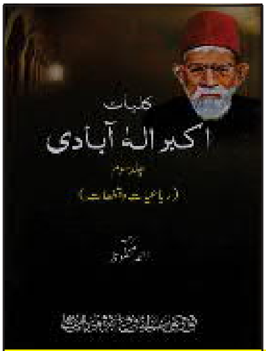

صفحات: 377، قیمت: 170 روپے

صفحات: 546، قیمت: 230 روپے

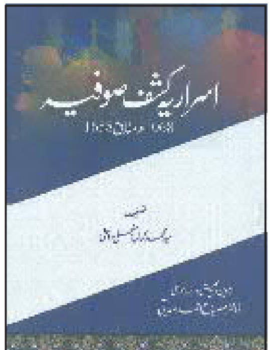

صفحات: 803، قیمت: 335 روپے

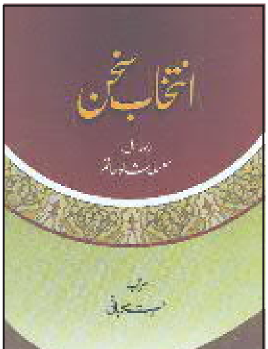

صفحات: 388، قیمت: 175 روپے

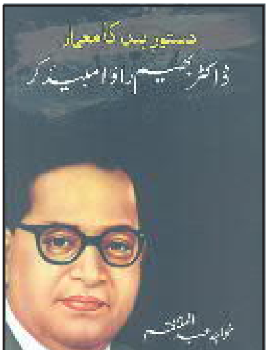

صفحات: 155، قیمت: 70 روپے

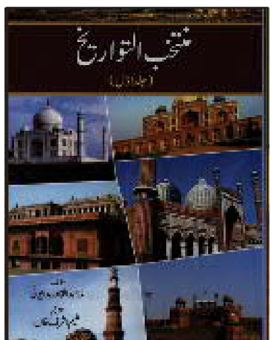

صفحات: 123، قیمت: 77 روپے

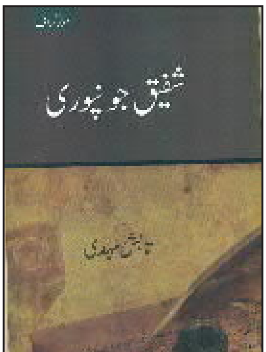

صفحات: 120، قیمت: 75 روپے

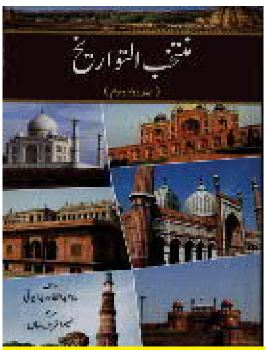

صفحات: 215، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, July 2017, Vol. 05, Issue: 7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/06/17
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

'بچوں کی دنیا' ایک بے مثال تحفہ، اردو اسکول، عربی مدارس کے بچوں کو پیش کیجیے۔

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش، ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل 'بچوں کی دنیا'

پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سلام، جنھوں نے فروغ اردو کے سفر میں دامن اردو کو وسیع اور خوش نما بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے ماہنامے 'بچوں کی دنیا'، 'اردو دنیا'، 'خواتین دنیا' کو گھر گھر تک پہنچائیں۔ ہمیں لاکھوں بچوں اور اداروں تک حقیقی فروغ اردو کے لیے ماہنامہ بچوں کی دنیا ... ملک کی ہر ریاست کے مختلف علاقوں میں پہنچانا ہے۔ عربی مدارس، اردو اسکولوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کا ڈاٹا بنا کر ملک کے ہر گھر میں 'بچوں کی دنیا' پہنچانے کی مہم چلانا ہے جس سے بچے خود کی قابلیت کو طالب علمی کے دور میں ہی فروغ دیں گے۔

'بچوں کی دنیا' ایک مقدس انجمن ہے۔ علم کو محدود نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی اسے ذخیرہ کرکے قید کیا جاسکتا ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں کے ہزاروں اردو اسکول، لاکھوں عربی مدارس میں 'بچوں کی دنیا' سوشل کلب، قائم کریں۔ اس کمیٹی کی قیادت تعلیمی اداروں کے پرنسپل کریں۔ اس کمیٹی کے افراد نہ صرف اس میگزین کے مضامین بچوں کو اور ان کے والدین کو پڑھ کر سنائیں بلکہ تعلیمی و ترقیاتی امور پر تبادلہ خیال کریں۔

نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول پونہ کی اردو ٹیم نے اس کا آغاز کیا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' ہر ماہ فی الحال 50 کاپیاں سال بھر میں بچوں اور ان کے والدین تک پہنچائیں گے۔ آئندہ 50 کاپیوں کے بجائے 5000 کاپیاں تقسیم کرنے کا عزم ہے۔ آپ بھی اپنے علاقے میں 'بچوں کی دنیا' سوشل کلب، قائم کریں، جس سے لاکھوں بچوں کو فیض حاصل ہوگا۔ 'بچوں کی دنیا' سے زمانہ کی خرابیاں اور برائیوں سے بچے محفوظ رہے گا۔ عجیب و غریب خبریں، معلوماتی مضامین کے علاوہ کہانیاں، ہنسی کے غبارے، دماغی ورزش، ننھے فنکار اور ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم سے بچوں کا مستقبل روشن ہوگا۔

قیمت فی شمارہ:-/10 روپے

سالانہ:-/100 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک، 8 ونگ 7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

موبائل نمبر:011-26109746: ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsalesunit@gmail.com

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.